MADURAI KAMARAJ UNIVERSITY

(University with Potential for Excellence)

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION

B.A.,

URDU LITERATURE

FIRST YEAR

POETRY, RHETORIC AND PROSODY

www.mkudde.org

5011

UURD01

MADURAI KAMARAJ UNIVERSITY

(University with Potential for Excellence)

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION

Palkalai Nagar, Madurai – 625 021, India

Ph : 0452 – 2458471 (30 Lines)   Fax : 0452 – 2458265

E-mail	: mkudde@mkudde.org
General grievances	: mkudde grievance@gmail.com
UG Courses	: mkuddeug@gmail.com
PG Courses	: mkupg@gmail.com
MBA Courses	: mkuddembag@gmail.com
MCA Courses	: mkuddemcag@gmail.com
Education Courses	: mkuddeedu@gmail.com
Website	: www.mkudde.org
IVRS	: 0452 – 2459990
	: 0452 - 2459596

Student Support Service : 0452 – 2458419

DDE – Examinations	
Fax	: 0452 - 2458261
E-mail	: mkuace@yahoo.com
Examn. Grievance Redress Cell	: 0452 – 2458471 – Extn. 515

Reading Material Disclaimer

This reading material, developed by **Dr. p. Ahmed Basha** and reviewed by **Dr. Azeezur Rehman Quraishi** is an aid for the students of Directorate of Distance Education, Madurai Kamaraj University, to understand the course content. It is only for the registered students of DDE, MKU and is not for private circulation.

© All copy rights & privileges are reserved

Madurai Kamaraj University

(University with Potential for Excellence)

Palkalai Nagar, Madurai - 625 021

Directorate of Distance Education

B.A. URDU

First Year 2013 -2014

Paper I: POETRY, RHETORIC & PROSODY

www.mkudde.org

5011

UURD01

فہرست

1۔غزل ایک تعارف

2۔ولی دکنی

(الف) غزل: مفلسی سب بہار کھوتی ہے

خلاصہ

(ب) غزل: وہ نازنین ادا میں اعجاز ہے سراپا

خلاصہ

3۔میر تقی میر

(الف) غزل: الٹی ہوگئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

خلاصہ

(ب) غزل: میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی

خلاصہ

4۔مرزا غالبؔ

(الف) غزل: سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئی

خلاصہ

(ب) غزل: آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک

خلاصہ

5۔جگر مرادآبادی

(الف) غزل: ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں

خلاصہ

6۔ نظم ایک تعارف

7۔ علامہ اقبال

(الف) مسجد قرطبہ

خلاصہ

دعا (مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر)

خلاصہ

(ب) ساقی نامہ

خلاصہ

8۔ فیض احمد فیض

(الف) صبح آزادی

خلاصہ

(ب) نثار میں تیری گلیوں کے

خلاصہ

9۔ ساحر لدھیانوی

(الف) تاج محل

خلاصہ

10۔ مخدوم محی الدین

(الف) چارہ گر

خلاصہ

(ب) چاند تاروں کا بن

خلاصہ

غزل ایک تعارف

غزل آج بھی اردو کی سب سے زیادہ مقبول صنف سخن ہے۔ لفظ ''غزل'' کے کئی معنی ہیں محبوب سے باتیں کرنا، عورتوں کی باتیں کرنا، عورتوں سے باتیں کرنا۔ یعنی بنیادی طور پر غزل میں عشقیہ باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ غزل میں اور طرح کے مضامین بھی داخل ہوتے گئے اور آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزل میں تقریباً ہر طرح کی باتیں بیان ہوسکتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ غزل کی ابتدا قصیدے سے ہوئی۔ قدیم عربی شاعری میں قصیدے کے شروع میں کچھ اشعار معشوق کی یاد میں یا موسم بہار کی آمد وغیرہ پر لکھے جاتے تھے۔ ان اشعار کو ''تشبیب'' کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تشبیب کے مضامین پر مبنی اشعار قصیدے کے علاوہ آزادانہ بھی کہے جانے لگے اور اس طرح غزل وجود میں آئی۔

دوسرا نظریہ یہ بھی ہے کہ اسلام سے قبل ہی عربی میں ایک شاعری وجود میں آچکی تھی جسے ''عذری'' کہا جاتا تھا۔ یہ نام اس لیے پڑا کہ یہ شاعری عذری نامی ایک قبیلے میں بہت مقبول تھی بلکہ عذریوں کو ہی اس کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ اس شاعری کو غزل نہیں کہتے تھے لیکن اس میں غزل کی صفات موجود تھیں یعنی نظم میں ہر شعر الگ الگ مضمون کا ہوتا تھا، پہلا شعر یعنی مطلع ہم قافیہ ہوتا تھا اور ہر نظم میں پاکیزہ محبت کے درد بھرے مضامین بیان ہوتے تھے۔ غزل کی یہ صفت کہ اس میں زیادہ تر ہجر اور تنہائی اور دردمندی کی باتیں بیان ہوتی ہیں اب بھی باقی ہے۔

غزل کے شعروں میں الگ الگ مضمون بیان کرنے کی رسم کو بعض لوگوں نے بہت کڑی نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بعض لوگوں نے جواب میں کہا ہے کہ غزل کے شعروں میں کوئی ربط نہ بھی ہو تو کیا ہوا، پوری غزل کا ایک مزاج یا کیفیت تو ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ غزل میں مربوط مضامین بیان کرنے کی بھی گنجائش ہے یعنی شاعر اگر چاہے تو پوری غزل میں ایک ہی بات کو پھیلا کر کہے (اس کو ''غزلِ مسلسل'' کہتے ہیں) یا شاعر اگر چاہے تو غزل کے درمیان قطعہ لے آئے جس کے اشعار مربوط ہوتے ہیں۔ غزل کا ہر شعر ایک پوری نظم کے برابر ہوتا ہے بلکہ اچھا شعر تو ایک نظم سے بڑھ بھی جاتا ہے۔

غزل تمام دنیا کی شاعری میں لاثانی اور سب سے زیادہ لچک دار صنف سخن ہے۔ دنیا کی شاعری میں کسی ایسی صنف کا وجود نہیں جس میں غزل مانند بحر اور ردیف وقافیہ کی وحدت ہو لیکن ہر شعر اپنا وجود بھی رکھتا ہو۔غزل کی یہ صفت نہایت قیمتی ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں غزل کی ابتدا عربی شاعری کے اثر سے ہوئی اور فارسی شاعروں نے غزل کو واقعی غزل بنایا۔ گیارہویں صدی کے آتے آتے غزل ایک مشہور اور مضبوط صنفِ سخن بن گئی۔ فارسی کے ذریعے یہ کئی زبانوں تک پہنچی جن میں ترکی اور اردو سے زیادہ اہم ہیں انیسویں صدی کے بعض جرمن شاعروں نے بھی اسے قبول کیا اور وہاں یہ Ghasel کے نام سے کئی بڑے شاعروں میں مقبول ہوئی اور آج کل ہندوستان کی کئی زبانوں میں بھی غزل لکھی جا رہی ہے۔ جن میں تمل زبان بھی شامل ہے کوی کو عبد الرحمٰن نے اس کی داخلیت کو اپنایا اور کئی غزلیں لکھیں۔ لیکن اس کی خارجی اور داخلی خصوصیات کے ساتھ پہلے پہل ایروڈ تمل انبن نے غزلیں لکھیں اور غزلوں کا مجموعہ شائع کیا۔

☆☆☆☆☆☆

ولی دکنی

ولی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے ان کا جنم 1667 کو ہوا۔ ایک مدت تک گجرات میں رہے اپنے وقت کے سب سے زیادہ مشہور شاعر تھے، ایک زمانہ میں خیال تھا کہ یہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام دیوان کی صورت میں مل سکا ہے لیکن یہ خیال اب غلط ثابت ہو گیا اس لئے کہ محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی مل گیا اور چھپ بھی گیا ہے، محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ ولی سے سو سال پہلے کا ہے اس لئے فی الحال اولیت کا سہرا اسی کے سر ہے۔

ولی کا احسان صرف دکن تک محدود نہ تھا بلکہ شمالی ہند کو بھی ان کی ذات سے فائدہ پہونچا ولی کو سیر و سیاحت کا کافی شوق تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں دکن سے دہلی آئے تھے، اور اپنی شاعری کے لئے مشہور ہو گئے۔ سورت اور احمد آباد بھی گئے تھے۔

کلیات ولی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی قریب قریب اردو کے ہر صنف شاعری پر قادر تھے، غزل قصیدہ، رباعی، مستزاد، قطعہ، ترجیع بند، مثنوی کے علاوہ کئی اور اضافہ پر بھی ولی نے طبع آزمائی کی ہے

غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے یہاں تغزل کے علاوہ اخلاقی مضامین وغیرہ بھی موجود ہیں۔ گو باتیں عموماً سیدھی سادی ہوتی ہیں مگر جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں وہاں تخیل کی گہرائی قابل دید ہوتی ہے خاص کر ان مقامات پر جہاں تصوف کے نکات بیان کرتے ہیں۔ چونکہ خود صوفی منش تھے اور برسوں خانقاہوں میں رہ کر درس معرفت حاصل کر چکے تھے اس لئے معنویت کے ساتھ پُر لطف طریقے سے رموز حقائق قلم بند کرتے ہیں جس سے غزل میں ایک جان سی آجاتی ہے ولی کی زبان عموماً صاف و شیریں ہے، پرانے اور نامانوس الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ انھوں نے فارسی کی خوبصورت ترکیبوں اور ہندی اور فارسی کے منتخب الفاظ کی آمیزش سے اپنے کلام کو اس طرح آراستہ کیا ہے کہ دلکشی اور صفائی ہر جگہ نمایاں ہے یہاں تک کہ بعض اشعار پر دھوکا ہوتا ہے کہ شاید آج کے کہے ہوئے ہیں۔

ولی کی غزلوں میں خارجی پہلو زیادہ ہے لیکن برجستگی اور کیف کی وجہ سے بیان میں مزہ باقی ہے، چونکہ صاحب معرفت تھے لہٰذا دل کے سوز و گداز کا اثر کلام میں بھی نمایاں ہے اور سادگی بیان کی وجہ سے

غزل

ولی دکھنی

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کیوں کے حاصل ہو مجکو جمعیت
زلف تیری قرار کھوتی ہے

ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب
مجھ انکھیاں کا خمار کھوتی ہے

کیوں کے ملنا ضم کا ترک کروں
دلبری اختیار کھوتی ہے

اے ولی آب اس پری رو کی
مجھ سنے کا غبار کھوتی ہے

خلاصہ

لی دکھنی اردو کے ابتدائی دور کے شاعر ہونے کے باوجود ان کی زبان صاف ستھری سیدھی سادی ہے۔غزل کی پوری شوقی اور چلبلا پن میں دکھائی دیتا ہے

میں بڑی پتے کی بات بتاتا ہے کہ غریبی اور ناداری عام انسان کی خوشیوں کو چھین لیتی ہے۔وہ ہے بھی تو کر نہیں سکتا کہ مالی طور پر بے بس ہے۔دراصل مال و دولت خوشیاں بٹورنے کا ایک ہے۔اس کے بغیر مردوں کا اعتبار بھی اٹھ جاتا ہے لوگ غریب پر بھروسہ نہیں کرتے۔اس پر کوئی کرتا کیونکہ وہ لاچار اور مجبور ہوتا ہے۔

ے محبوب! میں کیسے سکون اور اطمینان حاصل کروں۔میرا دھیان ایک جگہ ٹھہرتا نہیں ہے زلفیں مجھے بے قرار کر دیتی ہیں۔تیری زلفوں کے پیچ و خم میرے دھیان کو ہٹا دیتی ہیں۔

تاثیر دوبالا ہوجاتی ہے۔

ان کی تشبیہات واستعارات میں جدت ہے ۔، بعض اداؤں کا خیال کر کے معشوق کو ''بانکے پٹھان'' کہہ دیا ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں کم ملے گی۔

ولؔی کے قصائد پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے، جتنی خوبیاں قصیدے میں ہونی چاہیے وہ سبھی موجود ہیں، شوکت الفاظ بھی ہے، زور بھی اور مشکل زمین کا استعمال بھی ہے۔

ولؔی نے دہلی آکر یہاں کی زبان کو متاثر بھی کیا اور اثر بھی لیا۔ اتنا اثر لیا کہ دکنی زبان اور محاورات کو کم کر کے دہلی کی زبان اور محاوروں کو اپنے کلام میں تیزی سے جگہ دی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی الفاظ اور مقامی اثرات جو اردو زبان میں آرہے تھے وہ کم ہونے لگے اور فارسی الفاظ وتخیل زیادہ زور کے ساتھ اردو میں داخل ہونے لگے چونکہ دہلی کے اس وقت کے شعرا ولؔی کے کلام سے متاثر تھے اس لئے انھوں نے بھی یہی رنگ اپنی شاعری کو دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ طرز تخیل اور طرز بیان دونوں میں فارسی کا اثر غالب ہونے لگا، ولؔی کے آنے سے پہلے ہی شمالی ہند میں اردو زبان اور شعر کا چرچا عام ہوگیا تھا، یہاں بزم سخن پہلے ہی سے تھی ولی کی آمد نے اس بزم میں تازگی پیدا کردی، ولی کا انتقال 1707 میں ہوا۔

☆☆☆☆☆☆

خلاصہ

تمہید: ولی دکنی کی اس غزل میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے حسن کی تعریف میں رطب اللسان ہے چونکہ ولی کا دور ابتدائی دور ہے اس لئے اس غزل میں ایسے الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے جواب متروک ہیں۔ جیسے سوں، شناساں، ہور، یو وغیرہ ہے سراپا ردیف ہے۔ اور ممتاز، انداز وغیرہ قوافی۔ قوافی کا اچھا استعمال کیا ہے۔

۱) اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہوئے شاعر مطلع میں کہتا ہے کہ میرا محبوب (وہ) خوب صورت دوشیزہ اپنی ناز و ادا میں سرتاپا اعجاز ہے، خدا کی رحمت ہے، کرشمہ ہے۔ کہیں کہیں ہی ایسا حسن و ادا دیکھنے کو ملتا ہے خوبصورتی کے ساتھ اس میں اتنی خوبیاں بھری ہیں کہ حسین ترین گل، اخوں میں یہ سب سے جدا، سب سے ممتاز دکھائی دیتا ہے۔

۲) اے محبوب! تیرے عاشق کو قتل کرنے کا تیرا انداز ہی نرالا ہے۔ نہ ہاتھ میں تلوار اور تیر و کمان۔ پھر بھی عاشق گھائل ہو جاتا ہے۔ جب میں نے اس پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ تیری نگاہیں خود بڑی تیر انداز ہیں۔ اپنی نگاہوں کے تیر سے ہی تو عاشق کو قتل کر دیتا ہے۔

۳) دنیا کے سارے اعلیٰ فکر، مدبر، مفکر اور اداشناش لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ ناز و انداز میں تیرا قد سب سے اونچا ہے۔

۴) دنیا بھر کے حسن اور دلبر تیری برابری کر ہی نہیں سکتے۔ تیرا حسن اور تیری ادا نعمت خداوندی ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

۵) شاعر اس شعر میں محبوب کو دمِ عیسیٰ سے مخاطب کیا ہے اور کہتا ہے جس طرح حضرت عیسیٰ اپنی پھونک سے یا آواز سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے، میں بھی تیرا عاشق بیمار ہوں اور میری جان نکلنے ہی والی ہے۔ ذرا مجھ پر بھی رحم فرما اور ایک آواز سے میری بھی جان بخش دے۔ مجھے بھی زندہ کر دے۔

۶) مقطع میں شاعر ذرا اطمینان کا اظہار کر کے کہتا ہے کہ اے ولی مجھے پتہ ہے کہ میرا محبوب مجھ پر ہمیشہ مہربان رہتا ہے ہاں یہ اور بات ہے ظاہری طور پر وہ بے نیاز لگتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

میرا چین وسکوں سب کچھ چھن چکا ہے۔

۳۔میری آنکھیں میں شراب نوشی کی وجہ سے خمار آلود ہیں مگر تیری نگاہوں کی شراب اس قدر تیز ہے کہ میری ان نشہ آور آنکھوں کا نشہ بھی اتر چکا ہے۔تیری آنکھوں کی مستی کے آگے تمام نشے بے کار ہیں۔

۴۔میں اپنے محبوب کا ستایا ہوا ہوں۔اس سے ملنا نہیں چاہتا مگر میں ایسا کر نہیں سکتا کیونکہ اس کی ادائے دلبری اتنی پرکشش ہے کہ میں بے اختیار ہو کر اسی سے ملنے کے لئے نکل پڑتا ہوں۔

۵۔مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے ولی! میرا محبوب اتنا خوب صورت ہے کہ پری لگتا ہے اور اس پری صورت کی آب وتاب سے میرا سینہ آبدار ہو جاتا ہے چمک اٹھتا ہے۔میرے دل میں جو نور اور آب وتاب ہے وہ اسی پری رو کی وجہ سے ہے۔

غزل

ولؔی دکھنی

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا
خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا

اے شوخ تجھ نین میں دیکھا نگاہ کر کر
عاشق کے مارنے کا انداز ہے سراپا

جگ کے ادا شناساں ہے جن کی فکر عالی
تجھ قد کوں دیکھ بولے یوناز ہے سراپا

کیوں ہو سکیں جگت کے دلبر ترے برابر
تو حسن ہور ادا میں اعجاز ہے سراپا

گاہے اے عیسوی دم یک بات لطف سوں کر
جاں بخش مجھ کو تیرا آواز ہے سراپا

مجھ پر ولؔی ہمیشہ دل دار مہرباں ہے
ہر چند حسب ظاہر طناز ہے سراپا

☆☆☆☆☆☆

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد وغم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

یہ درد وغم میر کی زندگی کی ناکامیوں اور محرومیوں کے بھی تھے اور دلی کی تباہی و بربادی کے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ میر کی شاعری کو "دل اور دلی کے مرثیے" کہا گیا ہے۔ میر کے اشعار میں جو سوز و گداز اور اثر وتاثیر ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ ان کی بات دل سے نکلتی ہے اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اسی کیفیت کی بدولت ان کے اشعار کو نشتر کہا جاتا ہے۔ دلی جذبات ومحسوسات کو انھوں نے سیدھی سادی زبان اور عام بول چال کے لہجے میں اس فن کاری کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی آپ بیتی جگ بیتی اور ان کا غم زمانے بھر کا غم معلوم ہوتا ہے۔ سادگی میں بے مثال فن کاری کی بدولت ان کی غزلیں عوام وخواص دونوں میں یکساں مقبول ہیں۔

غزل

میر تقی میر

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سفید وسیاہ میں ہم کو جو دخل ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یاں دن کو جوں توں شام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

میر تقی میر

میر محمد تقی نام، اکبر آباد (آگرہ) میں 1924 میں پیدا ہوئے۔ میر کے والد کا نام میر عبداللہ تھا۔ کچھ لوگوں نے ان کا نام میر علی متقی بتایا ہے۔ میر کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد نیز والد کے مرید سید امان اللہ کا بڑا حصہ رہا۔ میر تقی میر امان اللہ کو چچا کہتے تھے۔ دس سال کی عمر میں میر کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کی وفات کے بعد میر کے سوتیلے بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے ان کے ساتھ بڑی بدسلوکی و بے مروتی کی جس سے تنگ آ کر وہ دہلی چلے آئے اور انھیں بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں قیام کیا۔ خان آرزو نے بھی میر کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ میر دل برداشتہ ہو کر آگرہ واپس چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد پھر دہلی چلے آئے۔ دہلی میں میر کی زندگی بڑے آلام و مصائب میں گزری۔ ایک تو ان کی ذاتی پریشانیاں، اوپر سے دلی، جسے وہ اپنا وطن سمجھتے تھے اور جس سے انھیں جذباتی لگاؤ تھا، اس کی تباہی و بربادی انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ دلی کی یہ تباہ حالی ان کے لیے ہمیشہ سوہانِ روح بنی رہی۔ دلی کے اجڑنے کے بعد میر لکھنو چلے گئے۔ وہاں نواب آصف الدولہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی لیکن دلی کی محبت اور وہاں گزارے ایام کی یاد ان کے دل سے کبھی محو نہ ہوئی۔ میر نے عمر کا باقی حصہ لکھنو ہی میں بسر کیا اور وہیں 1810 میں سپردِ خاک ہوئے۔

میر کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ وہ ایک فطری شاعر اور فن شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کے زمانے سے لے کر آج تک بڑے بڑے شعرا اور ناقدین نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ سودا، ذوق اور غالب جیسے اساتذہ نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ میر نہایت پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو میں ان کے چھ دیوان ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے ''ذکرِ میر'' کے نام سے فارسی میں اپنی آپ بیتی بھی لکھی، اور ''نکات الشعرا'' کے نام سے اردو شاعروں کا تذکرہ لکھا جو بالاتفاق اردو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ قرار دیا جاتا ہے۔

میر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے۔ ان کی حقیقی عظمت اور شہرت کا باعث ان کی غزلیہ شاعری ہی ہے اور اسی کی بدولت انھیں خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ میر کی غزلیں ان کی زندگی اور ان کے عہد کا مرقع ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی اور اپنے ماحول کا تمام درد و غم اپنی غزلوں میں سمو دیا ہے۔ خود کہتے ہیں۔

غزل

میر تقی میر

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اسکی
اللہ اللہ رے طبعیت کی روانی اس کی

خاطر بادیہ سے، دیر میں جاوے گی کہیں
خاک، مانند بگولے کے، اڑانی اس کی

ایک ہے عہد میں اپنے، وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مہنہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو، تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی

کر کے تعویذ رکھیں اس کو، بہت بھاتی ہے
وہ نظر پاؤں پہ، وہ بات دوانی اس کی

اس کا وہ عجز، تمہارا یہ غرورِ خوبی
منتیں اس نے بہت کیں، پہ نہ مانی اس کی

کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ، ہے رشک بہار
رقعہ واریں ہیں، یہ اوراقِ خزانی اس کی

سرگزشت اپنی، کس اندوہ سے، شب کہتا تھا
سو گئے تم، نہ سنی آہ، کہانی اس کی

خلاصہ

تمہید: میر تقی میرؔ کی یہ غزل بہت مشہور غزل ہے۔اس پوری غزل میں یاس وحسرت دکھائی دیتی ہے جو ان کا خاصہ ہے۔

۱۔ مطلع میں یوں فرماتے ہیں کہ دنیا کی تقریباً ہر بیماری کا علاج ہوسکتا ہے۔لیکن دل کی بیماری یعنی عشق کا کوئی علاج نہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی علاج ہے بلکہ جب اس بیماری کا علاج کیا بھی جاتا ہے تو یہ اور بڑھ جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ مریض عشق کو جب آپ دوا دیتے ہیں تو اس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کی بات نہیں مانتا۔ بیماری دل، مرضِ عشق کو دور کرنے کی ساری تدبیریں الٹی ہوگئی دوائیں بے کار یعنی اس پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا اور مریض عشق جان سے چلا گیا۔

۲۔ جب جوانی کے دن تھے ہم نے بجائے کچھ عمل کرنے کے رورو کر گزار دئے اور بڑھاپے میں آنکھیں بند کرلی۔ ایسا لگتا ہے کہ رات بھر ہم جاگتے رہے جبکہ ہمیں سونا چاہئے تھا۔ اور دن بھر جب ہمیں جاگنا چاہئے تھا ہم نے سوکر گذار دیا۔ یعنی ہمارے سارے کام الٹے رہے۔

۳۔ اس دنیا میں ہم تو مجبور ہیں نہ ہمارے عمل کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے اور نہ ہی ہماری اپنی تقدیر۔ ہم تو محض وہی کرتے ہیں وہ جو وہ چاہتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم پر خود مختاری کا الزام ہے۔ یہ تو ہمیں بدنام کرنے کی ایک چال ہے۔ یہ شعر محبوب اور اللہ دونوں کو مخاطب کر کے کہا جاسکتا ہے۔ محبوب کے آگے بھی شاعر مجبور ہے اور اللہ کے آگے بھی انسان بے بس ہے۔

۴۔ دنیا کے کاروبار میں ہم کو صرف اتنا اختیار ہے کہ رات دن جیسے تیسے کر کے گذارتے ہیں۔ رات بھر محبوب کی یاد میں روتے رہتے ہیں اور دن بس یوں میں گذار دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمارا یہاں کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔

۵۔ اے لوگو میرؔ کے مذہب کے بارے میں کیا پوچھتے ہو کہ وہ ہندو ہے کہ مسلمان۔ وہ تو کبھی کا اسلام چھوڑ چکا ہے اور ماتھے پر تلک لگائے مندر میں بیٹھ گیا ہے۔ کیونکہ وہیں بتوں کی پوجا ہوتی ہے اور میرؔ کا محبوب بھی تو ایک بت ہی ہے جو اس کی نہیں سنتا۔

☆☆☆☆☆☆

۷۔وہ (شاعر) کتنا عاجز، منکسر المزاج اور خاکساری کا پتلا تھا۔مگر تم اپنی خوبیوں پر غرور سے اتراتے تھے اس نے تم سے بہت منت سماجت کی مگر افسوس کہ تم نے اس کی ایک نہ مانی اور غرور پر اڑے رہے۔

۸۔موسمِ خزاں میں یہ جو پتے گر پڑتے ہیں ان میں بھی تمہارے متعلق ہوتا ہے۔موسم خزاں کے گرتے ہوئے پتوں کے باوجود ان پر بہار بھی رشک اس لئے کرتی ہے کہ اس پر تمہارا نام ہے۔

۹۔وہ رات اپنی داستان رو رو کر سناتا رہا مگر تم تو بڑے بے پرواہ نکلے۔کہانی سنتے سنتے ہی سو گئے۔اس بےکس کی پُرغم کہانی کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔افسوس ہے۔

۱۰۔شاعر کو دلی سے بہت پیار تھا۔دلی اجڑنے لگی تو ان کے دل پر اس کا بہت اثر پڑا۔انھوں نے شہر دلی کی بربادی کے مرثیے سب کو رو رو کر سنائے اب یہی اس کی نشانیاں دلی میں باقی رہ گئی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

مرثیے دل کے، کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے، سب یاس نشانی اس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی، پھوٹ بہی
دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

اب گئے اس کے، جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

خلاصہ

تمہید: میر تقی میر کو شہنشاہِ متغزلین کہا جاتا ہے۔ آپ کے اشعار میں تغزل کے ساتھ ساتھ درد اور رنج و الم کی بھرمار ہے عشق کے ساتھ مایوسی کی بھی انتہا آپ کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن زیرِنظر غزل میں جہاں خود ستائی کا انداز بھی دکھائی دیتا ہے وہاں یاس وحسرت کا اظہار بھی ملتا ہے۔

ا۔ غزل کا مطلع خود مقطع کا کام کرتا ہے جس میں میر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میر کے کہنے کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ اگر کوئی شعر سن کر مزہ لوٹنے کا خواہش مند ہو تو میر کی زبانی شعر سنے۔

۲۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ خاک اڑاتا ہوا نکل پڑا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کی خاطر وہ سبک روی سے کام لے مگر وہ تو بگولے کی مانند ہے۔

۳۔ حالانکہ وہ پراگندہ مزاج ہے۔ پریشان حال ہے مگر اس جیسا کوئی پراگندہ مزاج ہمیں اب تک کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیا۔

۴۔ تم نے بارش میں پانی کو تو برستے دیکھا ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح اس کے آنسو بھی برستے تھے۔

۵۔ جب وہ بات کرتا ہے تو گویا لوگوں پر جادو کر جاتا ہے مگر اس جادو بیانی کا کیا کیا جائے کہ ساری خاک میں مل گئی اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

۶۔ اس کی باتیں بہت پر اثر اور دل کو بھانے والی ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ نذر بد سے بچنے کے لئے انھی تعویذ بنا کر رکھا جاسکتا ہے۔

غزل

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کوان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی 'گو' نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

مرزا غالب 1796 کو پیدا ہوئے۔ غالب کو شعروشاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں اسد تخلص کرتے تھے، بعد میں غالب اختیار کیا۔ اسی تخلص سے مشہور ہوئے۔ غالب جس زمانے میں آگرہ سے دہلی منتقل ہوئے، دہلی میں شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا۔ انھیں اپنی عزتِ نفس کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ فطرتاً ذہین اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے۔ ذہانت اور شوخی کی یہ صفات غالب کے کلام سے بھی نمایاں ہیں۔ غالب کی ذہانت آمیز شوخی وظرافت کے پیشِ نظر حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں انھیں ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔

مرزا غالب اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اگرچہ اردو کی بہ نسبت انھیں اپنا فارسی کلام بہت عزیز تھا اور اسی پر فخر کرتے تھے لیکن ان کی شہرت اردو کلام ہی کی وجہ سے ہوئی۔ اردو میں ان کا صرف ایک دیوان ہے اور وہ بھی مختصر ہے مگر اپنی خوبیوں کی وجہ سے بڑے سے بڑے دیوان پر بھاری ہے۔

غالب کو عام راستے سے الگ نئی راہ بنا کر چلنے کا شوق تھا۔ اسی شوق نے آغازِ شاعری میں انھیں مشکل پسند بنا دیا مگر کچھ دوستوں کے مشورے اور اصرار پر انھوں نے یہ روش ترک کردی اور نسبتاً آسان زبان استعمال کرنے لگے، لیکن خیالات کی تازگی، موضوعات کی رنگا رنگی، فکر کی بلندی اور الفاظ کے معنی خیز استعمال کی بدولت ان کی امتیازی شان وانفرادیت برقرار رہی۔ بڑے سے بڑے مضمون کو فنی اختصار کے ساتھ بیان کرنے میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ بلاشبہ غالب ہمارے ایسے عظیم شاعر ہیں جن پر اردو زبان ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ مرزا غالب کا جنم 1796 کو پیدا ہوا اور 1869 میں انتقال کیا۔

☆☆☆☆☆☆

ہمیں بہت ستاتے ہیں اگر یہی محبوب جنت میں حور کی شکل میں ہمیں ملیں گی تو ہم ہر ایک سے دنیا میں ستائے جانے کا بدلہ ضرور لیں گے۔

۶۔ دربان ہمیں اپنے محبوب سے ملنے نہیں دیا کرتا تھا۔ اور ہم نے اس کو بہت دعائیں ہے جب جا کر ہم اس کے محل میں داخل ہو سکے۔ اب ہمیں دیکھ کر یقیناً ہمارا محبوب ہمیں بہت سی گالیاں دے گا۔ پر ہم گالیوں کا جواب گالیوں سے نہیں دیتے بلکہ گالیوں کا جواب دعاؤں سے دینے کے عادی ہیں۔ اب ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمیں جنتی دعائیں یاد تھی وہ تو دربان کو دے دیں۔ اب محبوب کی گالیوں کا جواب کس طرح دے پائیں گے۔

۷۔ ہمیں مذہب کی رسومات پر کوئی عقیدہ نہیں ہے، ہم تو توحید پرست ہیں۔ ہمارا طریقہ ہی رسومات کو ترک کر دینا ہے۔ جب ملتیں مٹ جاتی ہیں تو ایمان کا جز بن جاتی ہیں۔

۸۔ انسان پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی مصیبت یا آفت آتی رہتی ہے۔ اور وہ اس سے نپٹنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اگر انسان درد و غم کا ہمیشہ سامنا کرتا رہے اور اس سے نبرد آزما ہوتا رہے تو یہ اس کی عادت سی بن جاتی ہے اور پھر بڑی سے بڑی مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اسی طرح ہم پر اتنی مشکلیں اور آفتیں نازل ہو گئیں کہ اب تو کوئی مشکل ہمیں مشکل دکھائی نہیں دیتی۔ ہر مشکل آسان لگتی ہے۔

۹۔ مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اگر غالب اسی طرح روتا رہے گا تو دیکھنا ایک دن یہ ساری بستیاں ویراں ہو جائیں گی۔ یعنی اس کے غم و اندوہ کا وہ اثر ہوگا کہ بستی کی بستی برباد ہو کر رہ جائے گی۔

غزل

مرزا اسد اللہ خاں غالب

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

خلاصہ

تمہید: مرزا غالب نے سیدھی سادی عام فہم غزلیں بھی کہی ہیں اور مشکل ترین غزلیں بھی۔ نہ صرف بحروزمین کے اعتبار سے بلکہ خیالات اور مدفدع کے اعتبار سے بھی آپ نے انوکھے طرز اپنائے ہیں۔ یہ غزل ان کی مشکل پسندی کی ایک دلیل ہے۔

۱۔ دنیا میں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ بلکہ دنیا کی ہر تخلیق کا یہی انجام ہے۔ گل بوٹے پیڑ پودے وغیرہ زمین میں دفن ہوتے ہیں اور دوسری صورت میں پھر سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہر ایک کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا کئی مخلوقات دفن ہونے کے بعد پھر نہیں پیدا ہوتیں۔ کہتے ہیں کہ ساری مخلوقات پھولوں کی شکل میں کہاں نمودار ہوتی ہیں کئی ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں جو خاک میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتی ہیں چھپ جاتی ہیں۔ یہی خدا کا قانون ہے۔

۲۔ یہ چاند، ستارے اور سیارے دن بھر روشنی کی وجہ سے چھپ جاتے ہیں وہ ختم نہیں ہو جاتے مٹ نہیں جاتے صرف ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ یہی ستارے اور سیارے رات کی تاریکی میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جو چیز دکھائی نہیں دیتی مٹ نہیں جاتی بلکہ ہمیں دکھائی نہیں دیتی جب بھی موقع ملتا ہے ہمیں دکھائی دیتی ہے۔

۳۔ یہ تلمیحی شعر ہے جو قصہ حضرت یوسف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یوسف کو ان کے بھائیوں نے پسند نہیں کیا اور شہنشاہ وقت نے ان کے ناکردہ جرم کی سزا کے طور پر انھی قید کر دیا تھا۔ حالانکہ یعقوب نے یوسف کی کوئی خبر نہیں لی لیکن ان کی آنکھیں قید خانے کے اندر بھی دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یوسف کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

۴۔ یہ تلمیحی شعر بھی اسی تاریخی قصہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یوسف پر بدکاری کا الزام لگایا گیا مگر بہت جلد یہ بات صاف ہوگئی کہ خطاکار یوسف نہیں بلکہ زلیخا ہی ہے۔ جب زلیخا کی ساتھیوں نے یوسف کو دیکھا تو یوسف کی خوبصورتی سے اس قدر مرعوب ہوئیں کہ انھوں نے سیب کی بجائے اپنی انگلیاں تراش لی تھیں۔ اس طرف شاعر اشارہ کر کے کہتا ہے کہ زلیخا چاہے تمام رقیبوں سے ناراض ہو لیکن مصر کی عورتوں سے خوش ہے کہ وہ بھی یوسف کی خوب صورتی سے مرعوب ہوگئیں۔

۵۔ خدا نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں جنت میں حوریں عطا کی جائیں گی۔ اب دنیا میں تو یہ محبوب

مطلب یہ ہے کہ سورج نکلنا شبنم کے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہی اس کی تعلیم ہے۔ شاعر اب کہتا ہے کہ میں بھی اسی شبنم کی طرح پڑا ہوا ہوں ایک نظر بھر تم دیکھ لو تو میری فنا کے لئے کافی ہے یعنی یہی مجھ پر رحم اور مہربانی ہے۔

۶۔ محبوب کی ایک نظر ہمارے لئے ساری کائنات ہے۔ ہماری زندگی شمع کی لو کی ایک تھرتھراہٹ سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔

۷۔ اے اسد! جب تک زندگی رہے گی غم واندوہ ساتھ ساتھ رہیں گے غم سے نجات صرف موت ہی دلا سکتی ہے اس لئے ہمیں غموں کے ساتھ ہی زندگی گذارنی ہے اس سے ہم فرار اختیار نہیں کر سکتے۔ شمع کو ہم دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ جب رات کی شمع جلادی جاتی ہے تو وہ صبح تک جلتی ہی رہتی ہے۔ خواہ وہ غمگین ہو خوش اس سے شمع کا کوئی سروکار نہیں۔ انسان کی زندگی بھی اسی شمع کی مانند ہے کہ موت آنے تک ہمیں زندگی گذارنی ہی ہے چاہے ہم چاہے خوشی سے گذاریں یا غم واندوہ کے ساتھ گذاریں۔

☆☆☆☆☆☆

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

ایک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمئی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

خلاصہ

۱۔ مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ دل سے نکلنے والی آہوں کا فوری اثر نہیں ہوتا بلکہ ایک مدت لگ جاتی ہے کبھی کبھی تو ساری عمر ایک آہ کے اثر ہونے میں صرف ہو جاتی ہے ایسے میں ہم کب تک جئیں گے۔

۲۔ موجوں میں پیدا ہونے والا ہر ایک بھنور ایک دام لگتا ہے ایک جال لگتا ہے۔ سمندر کے سیپ میں بند ہونے والے ہر قطرے کو موتی بننے میں ایک عرصہ لگتا ہے اور اس عرصے میں وہ اتنی تبدیلیوں سے گذرتا ہے کہ اس کا بیان یہاں ممکن ہے۔

۳۔ عاشقی صبر کی طالب ہے اور ہماری تمنائیں بے تاب ہیں۔ ہم محبوب سے ملنا چاہتے ہیں مگر عشق کا فرمان ہے کہ صبر کرو۔ اسی کشمکش میں دل خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ اب اس بے قرار دل کو کیسے سنبھال پاؤں گا اس کا اندازہ نہیں ہے۔

۴۔ غالب محبوب سے مخاطب ہے کہ ہم یہ مانتے ہیں کہ تم ہمارے عشق کو ایک نہ ایک دن قبول کر ہی لو گے مگر تمہیں اس کی خبر ہونے تک ہم تو اپنی جان سے چلے جائیں گے۔

۵۔ راتوں کو پھول اور پتوں پر شبنم پڑتی ہے اور جب سورج کا نکلتا ہے وہ بخارات بن کر اڑ جاتی ہے اس کا

تیرا کرم بھی خود جو شریک ستم نہیں ملتا ہے کیوں مزہ ستم روزگار میں

کیا کم یہ ہے کہ فتنۂ دیر و حرم نہیں زاہد کچھ اور ہو نہ ہو مے خانے میں مگر

مرگ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز

اک سانحہ سہی، مگر اتنا اہم نہیں!

خلاصہ

تمہید: جگر مراد آبادی کی یہ بہت ہی مشہور غزل ہے۔ پوری غزل مرصع ہے اور قوانی کا اچھا استعمال کیا ہے۔نہیں اس غزل کی ردیف ہے۔

ا۔ غزل کا مطلع ہی بڑا زوردار خود اعتمادی سے بھرپور ہے شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں، یا دنیا کے لوگوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ ہمیں ختم کر سکے۔ ہم تو اس دنیا کو ہیچ سمجھتے ہیں کیوں کہ ہماری وجہ سے ہی دنیا کا کاروبار ہے دنیا کی وجہ سے ہم زندہ نہیں ہیں۔

۲۔خدا کی دی ہوئی کوئی بھی چیز معمولی نہیں ہوتی۔ ہر چیز خدا کی نعمت ہے۔یہاں تک کہ رنج والم بھی خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہی ہے۔کیوں کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے بھلائی کے لئے کرتا ہے۔

۳۔اے ستم گارو مجھے تم سے کوئی گلہ شکوہ یا شکایت نہیں ہے بلکہ میں تو تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے اپنے رویہ سے مجھے محتاط کر دیا۔ ورنہ میں تو تمہیں اپنا دوست سمجھتا تھا۔تمہاری حرکت نے مجھے تمہاری اصلیت سے آگاہ کر دیا۔ یہ مجھ پر تمہارا احسان ہی تو ہے۔

۴۔اے اللہ۔ابھی مجھے اور درد عطا کر۔غم و رنج عطا کر۔کیونکہ مجھ پر ابھی شاید تیرے قہر کا اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ میری آنکھوں میں آنسو تک نہیں آئے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مجھے اتنا درد ملے کہ آنسوؤں سے میرا دامن بھیگ جائے۔

۵۔اے محبوب! تیرے ظلم و ستم کا شکوہ محض ایک چھیڑ خوانی ہے سچ پوچھو تو تیرا ستم میرے لئے تیری عنایت ہی ہے۔

۶۔اب میرا عشق تلاش حق کے اس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں نہ کوئی سایہ ہے اور نہ کوئی رہبر یا رہبر کا نقش قدم۔ مجھے اپنی منزل خود تلاش کرنی ہے۔

جگر مراد آبادی

جگر کے بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع ، جوشاہ جہاں کے استاد تھے ،ترکِ وطن کر کے مراد آباد میں آ بسے تھے۔ یہیں جگر کی پیدائش ہوئی۔ اصلی نام علی سکندر تھا۔ان کے والد مولوی محمد علی نظر بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔جگر کی تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن شاعری کا شوق لڑکپن سے ہی تھا۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ابتدا میں اپنے کلام پر والد سے اصلاح لیتے تھے بعد میں داغ دہلوی اور منشی امیر اللہ تسلیم سے مشورۂ سخن کیا۔تین مجموعے داغِ جگر ،شعلہء طور اور آتش گل شائع ہوئے ہیں۔آخرالذکر کتاب پر ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ 9/ ستمبر 1960 کو جگر کا انتقال ہوگیا۔

جگر کی شاعری میں سرمستی وسرشاری کی کیفیت ہے جوانھیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔حسن وعشق اور شراب وشباب کے معاملات وکیفیات کو بڑے والہانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کیفیت ومستی کا یہ انداز معرفت کے مضامین میں بھی نظر آتا ہے۔رنگین وپرکیف خیالات، سادگی ،روانی اور ترنم جگر کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔عموماً عام فہم اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اکثر وہ الفاظ کی تکرار سے بھی کام لیتے ہیں جس سے کلام میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

غزل

جگر مرد آبادی

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں — ہم سے زمانہ خود ہے، زمانہ سے ہم نہیں

بے فائدہ الم نہیں، بیکار غم نہیں — توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

میری زباں پہ شکوہ،اہل ستم نہیں — مجھ کو جگا دیا، یہی احسان کم نہیں

یارب ہجوم درد کو دے اور وسعتیں — دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

شکوہ تو ایک چھیڑ ہے،لیکن حقیقتہ — تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں

اب عشق اس مقام پہ ہے جستجو نورد — سایہ نہیں جہاں،کوئی نقش قدم نہیں

نظم ایک تعارف

نظم کے لغوی معنی ''لڑی میں موتی پرونا'' ہیں۔ نظم کے دوسرے معنی ''انتظام'' ترتیب یا آرائش بھی ہیں۔ اردو میں ایک ادبی اصطلاح کے طور پر نظم کا لفظ دو مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ عام اور وسیع مفہوم میں یہ لفظ نثر کے مدمقابل کے طور پر بولا جاتا ہے اور اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے اور اس میں وہ تمام اصناف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں جو ہئیت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں۔ مخصوص و محدود مفہوم میں نظم شاعری کی اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص موضوع پر تسلسل کلام کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ نظم میں ایک سے زیادہ موضوعات بھی ہو سکتے ہیں، لیکن یہ سب ایک بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا ہوتا ہے۔ ارتقا Movement بھی نظم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقا واضح ہوتا ہے۔ مختصر نظموں میں ارتقا واضح نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔

نظم ان کی خصوصیات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں غزل کے علاوہ جتنی بھی اصنافِ شاعری ہیں وہ سب نظم میں داخل ہیں، لیکن اپنی چند الگ خصوصیات کی بنا پر کچھ اصناف جیسے قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ کے نام متعین ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان اصناف کو نظم نہ کہہ کر انھیں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ دراصل ایک صنف سخن کے اعتبار سے نظم کی اصطلاح ایک جدید تصور ہے اور جن معنوں میں ہم آج اس اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں، اس کا تصور پہلے زمانے میں نہیں تھا۔ اسی لیے اکثر نظم کے لیے نظم جدید کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب سے لی گئی کچھ اصناف جیسے گیت، دوہا، سانٹ وغیرہ کو بھی انھیں ناموں سے پکارا جاتا ہے، حالانکہ بنیادی طور پر یہ سب نظم ہی ہیں۔ نظم کے لیے نہ تو ہئیت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوعات کی۔ چنانچہ اردو میں غزل اور مثنوی کی ہئیت میں بھی مختلف قسم کے بندوں پر مشتمل نظمیں بھی، اور آزاد معرا نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح کوئی بھی موضوع نظم کا موضوع ہو سکتا ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے موٹے طور پر نظم کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۷۔اے اللہ اگر تیرا کرم شامل حال نہ ہوتا تو دنیا کی پریشانیوں میں بھی مزہ نہ ملتا۔

۸۔شاعر زاہد سے مخاطب ہے کہ اے زاہد! تو مئے خانے کو برا کہتا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ مئے خانے میں لاکھ برائیاں سہی لیکن ایک اچھائی یہ ہے کہ یہاں مندر و مسجد کے جھگڑے نہیں ہوتے۔ مئے خوار مذہب اور قوم کے امتیازات سے پاک ہوتے ہیں۔

۹۔مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب جگر کی موت پر تو کیوں آنسو بہاتا ہے۔جگر کی موت ایک سانحہ ہو سکتا ہے مگر اتنا بھی اہم سانحہ نہیں کہ اس پر آنسو بہائے جائیں۔

☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سر محمد علامہ اقبال

ڈاکٹر سر محمد علامہ اقبال 9/ نومبر 1877 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شمس العلما مولوی سید میر حسن سے فارسی، عربی اور دیگر مشرقی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ سیالکوٹ ہی میں ایک انگریزی اسکول سے امتیاز کے ساتھ انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اسکاچ مشن اسکول سے ایف۔ اے کیا۔ لاہور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ شاعری کی طرف بچپن سے مائل تھے۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی میں شعر کہتے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں داغؔ کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اقبال نے خط وکتابت کے ذریعے ان سے اصلاح لی۔ چند ہی دنوں میں انھوں نے فارغ الاصلاح کر دیا۔ داغ کی اصلاح نے اقبال کے کلام میں روانی اور زبان میں صفائی پیدا کی۔ لاہور ہی میں اعلیٰ تعلیم کے دوران پرفیسر آرنلڈ سے علم فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ جب پروفیسر آرنلڈ انگلینڈ چلے گئے تو انھیں کے اصرار پر اقبال نے 1905 میں یورپ کا سفر کیا۔ وہاں فلسفے میں مہارت حاصل کی اور فارسی ادب کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اس کے بعد جرمنی چلے گئے جہاں میونخ یونیورسٹی سے ایرانی فلسفے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لندن واپس آکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1908 میں ہندستان واپس آئے۔ ہندستان واپس آنے کے بعد وہ سررشتۂ تعلیمات سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد بیرسٹری شروع کر دی۔ اقبال کی عالم گیر مقبولیت اور علمی مشاغل سے متاثر ہو کر حکومت برطانیہ نے انھیں ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ بھی انھیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔

عمر کے آخری ایام میں اقبال کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور آواز بند ہو گئی تھی، جس کے باعث ہائی کورٹ جانا بند کر دیا تھا۔ بالآخر 21/ اپریل 1938 کو علامہ اقبال نے ایک طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔

علامہ اقبال کی تصنیفات انگریزی نثر، خطوط، فارسی نظموں، غزلوں اور اردو شاعری پر مشتمل ہیں۔ اردو میں ان کی شاعری کا سرمایہ بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضرب کلیم پر مشتمل ہے۔ ارمغان حجاز ان کے اردو اور فارسی کلام کا مشترک مجموعہ ہے۔

اقبال نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی، لیکن جلد ہی نظم کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ نظموں پر ہی مشتمل ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی نظمیں کہی ہیں۔ بچوں کی نظموں

1۔ پابند نظم:

''ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترتیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔ نئے انداز کی ایسی نظمیں بھی جن کے بندوں کی ساخت مروجہ ہیئتوں سے مختلف ہو یا جن کے مصرعوں میں قوافی کی ترتیب مروجہ اصولوں کے مطابق نہ ہو لیکن ان کے تمام مصرعے برابر ہوں اور ان میں قوافی کا کوئی نہ کوئی التزام ضرور پایا جائے پابند نظمیں کہلاتی ہیں۔ مثلاً مربع مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع نبد، گیت، دوہا وغیرہ۔''

2۔ نظمِ معرا

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے برابر کے ہوں مگر ان میں قافیہ نہ ہو، نظم معرا کہلاتی ہے۔ شروع میں اسے نظمِ غیر مقفیٰ یا بے قافیہ نظم کہا جاتا تھا، کچھ لوگوں نے اسے نظمِ عاری بھی کہا ہے۔ آج کل اسے نظمِ معرا ہی کہا جاتا ہے۔

3۔ آزاد نظم:

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی کی گئی ہو اور نہ بحر کے استعمال میں مروجہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، یعنی جس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوں، آزاد کہلاتی ہے۔ آزاد نظم میں وزن ہوتا ہے، قافیہ ضروری نہیں۔ آج کل نثری نظمیں بھی لکھی جارہی ہیں اور یہ بھی مقبول ہوتی جارہی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

مسجد قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو، جس میں نہ دن ہے نہ رات!

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات! کارِ جہاں بے ثبات!

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

میں ''ترانہء ہندی'' اور ''بچے کی دعا'' خصوصیت سے مقبول ہوئیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شروع سے آخر تک ان کی شاعری برابر ترقی کرتی رہی اور اس میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ اقبال نے اردو شاعری میں مختلف جہات سے اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے زبان کو جس فنکارانہ انداز سے برتا، اس سے اردو شاعری میں نئے خیالات کے اظہار کی مختلف راہیں کھلیں، نئی تشبیہات، استعارات اور تراکیب نے جگہ پائی اور اس طرح اردو زبان میں نئے تخلیقی امکانات پیدا ہوئے۔ منظر نگاری اور محاکات میں اقبال اپنے قلم سے وہی کام لیتے ہیں جو ایک مصور اپنے موقلم سے لیتا ہے۔ کہیں کہیں ثقیل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن وہ کلام کے ترنم اور جوش بیان کے باعث طبیعت پر گراں نہیں گزرتے۔ فارسی اور عربی کے الفاظ کا بے تکلف استعمال ان کی شاعری کا خاص وصف ہے، لیکن وہ اس سے کلام میں زور پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کو اپنے خاص پیام اور تعلیمات کی ترویج کا ذریعہ بنایا تھا۔ ان کی تمام تر فکر میں حرکت وعمل کا فلسفہ کارفرما ہے، جس کو انھوں نے فلسفہء خودی کے نام سے پیش کیا۔ علامہ اقبال کو قومی و مذہبی مسائل سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ مادیت اور مغربیت سے اجتناب کے خیالات بھی ان کے یہاں کارفرما ہیں۔ علامہ اقبال بلند ہمتی، خودی، خودداری، سربلندی اور نظر کی وسعت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان اوصاف کو انسانیت کی بقا کے لیے لازمی سمجھتے ہیں۔

مدراس کے مشہور تاجر چرم اور علم دوست جناب حاجی جمال محمد صاحب کی ایما پر آپ مدراس تشریف لائے اور فلسفہ و اسلام پر تقاریر کیں۔ ان کے ان خطبات کا مجموعہ The reconstruction of Religious Thoughts in Islam کے عنوان سے شائع ہوا جن کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود

عرشِ معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود!

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

تیری بنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل!

تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہ جبرئیل

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نیل!

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!

عشق دم جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکر گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام!

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات!
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!

قطرۂ خونِ جگر، سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ ''خلقِ عظیم'' صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے، شاہی نہیں!

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل!

ساقئ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل!

مردِ سپاہی ہے، وہ اس کی زرہ لاالٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لاالٰہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقامِ بلند، اس کا خیالِ عظیم
اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عالمِ نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب!

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ھر زماں اپنے عمل کا حساب!

نقش ہیں نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

خلاصہ

تمہید: یہ غیر فانی نظم جیسا کہ خود حضرت علامہ نے واضح کر دیا ہے، مسجد قرطبہ ہسپانیہ کے دوران قیام میں اس اجڑے دیار کی جامع مسجد کی زیارت کے بعد لکھی گئی تھی۔ یہ مسجد صدیوں سے محروم اذاں ہونے کے باوجود آج بھی تمام دنیا کی مساجد کی سرتاج ہے اس کی وسعت اور شان وشوکت کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ:

(الف) اس کا طول وعرض 440x 648 فٹ ہے۔ یعنی وسعت کے لحاظ سے دنیا میں سب سے بڑی مسجد ہے۔

(ب) جامع مسجد دہلی کی تعمیر پر دس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ لیکن اس مسجد پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ سے زائد خرچ ہوا تھا۔

بلاشبہ یہ مسجد عجائبات عالم ہے۔ اس کو سلطان عبد الرحمٰن الداخل نے جامع دمشق کے نمونہ پر تعمیر کرایا تھا اور اس کے جانشینوں نے اسے پایہ تکمیل تک پہونچایا ۱۲۳۶ء میں زوال قرطبہ کے بعد یہ عدیم المثال مسجد، گرجا بن گئی یعنی فاتحین نے اس کی محراب کے سایہ میں ایک چھوٹا سا گرجا تعمیر کرلیا۔ اسی

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!

دیکھ چکا المنیؔ شورشِ اصلاح دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں

حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیر کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلابؔ
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!

سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب!

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

پہلا بند

پہلے بند میں آٹھ شعر ہیں۔ جن میں سے پہلے چھ شعروں میں اقبال نے سلسلہء روز وشب کی، جسے عام طور سے لوگ زمانہ کہتے ہیں حقیقت واضح کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ اے مخاطب تیرے شب وروز کی، یعنی جسے تو زمانہ سمجھتا ہے، ماہیت یہ ہے کہ وہ حقیقی زماں کی ایک رو ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات ہے۔ نہ ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل ہے۔

اقبالؔ نے یہاں سلسلہء روز وشب کی حقیقت تو واضح کر دی کہ وہ زمانہ کا نام ہے لیکن اس رویا حقیقی زماں کی ماہیت واضح نہیں کی کہ زمانہ کی حقیقت کو سمجھنا یا سمجھانا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنی خودی سے واقف نہ ہو، زمانہ کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا اقبالؔ متکلمین اور بعض حکمائے مغرب کے مقابلہ میں، زمانہ کو حقیقی مانتے ہیں بایں معنی کہ وہ خارج میں موجود ہے اور ''الحقیقۃ'' کا ایک لازمی عنصر ہے۔ یعنی اس کی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اس کی حقیقت کو اپنے باطن میں محسوس کر سکتے ہیں۔ گویا حقیقی زمانہ ہمارے ایک باطنی احساس کا نام ہے یہ حقیقی زماں، ایک نوع کی تخلیقی فعلیت (Creative activity) ہے جس میں نہ ماضی ہے نہ حال ہے نہ مستقبل ہے، بلکہ اس کو دوران خالص (Pure duration) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس حقیقی زمانہ، یعنی مرور خالص سے زمان مسلسل پیدا ہوتا ہے جسے ہم سلسلہء روز وشب کہتے ہیں۔ حقیقی زمانہ ایک رو کا نام ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات اور نہ اوقات ہیں نہ لمحات بلکہ وہ ایک وحدت ہے۔ اس حقیقی زمانہ کا ادراک حواس خمسہ سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمارا شعور اس کا ادراک کر سکتا ہے۔ یعنی زندگی خود، زمانہ کے اسرار میں سے ایک سر دبھید ہے، بلکہ دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے حقیقی زمانہ، روح انسانی کی طرح ایک راز ہے جس سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو اپنی خودی سے واقف ہو۔ اور خودی سے آگاہ ہونے کا طریقہ دنیا میں ایک ہی ہے اور عشق الٰہی ہے۔ یعنی صرف عاشق، زمانہ کی حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے اور ارباب نظر سے یہ نکتہ مخفی نہیں ہے کہ جب تک آپ کسی شئے کی حقیقت سے آگاہ نہ ہوں، اس وقت تک اس کو مسخر نہیں کر سکتے۔

اگر زمانہ کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو دل میں غوطہ لگاؤ، یعنی عشق الٰہی، اختیار کرو کیونکہ عشق خود اصلِ حیات ہے اور زمانہ کی دست برد سے بالاتر ہے۔ چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں۔

انقلاب کو دیکھ کر اقبالؔ نے یہ مصرع موزوں کیا تھا۔ "عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں"

جس طرح یہ مسجد عربوں کے فن تعمیر کا شاہکار ہے، اسی طرح اقبال کی یہ نظم جدید اردو ادب کا شاہکار ہے۔ اس میں رمزیئت اور ایمائیت (Symbolism) رومانیت اور جذبات نگاری (Romanticism) حقیقت پسندی اور شعریت، یعنی فن شاعری کی تمام خوبیاں بیک وقت جمع ہوگئی ہیں۔ اور اقبالؔ نے اپنی خداداد شاعرانہ قوت سے کام لے کر ان تمام صوری اور معنوی خوبیوں کو اس طرح باہم وگر مربوط کر دیا ہے کہ اگر ایک طرف اس نظم میں غیر معمولی دلکشی پیدا ہوگئی ہے تو دوسری طرف خود ان کا شمار دنیا کے صف اول کے شعرا میں ہوگیا ہے گوئٹے (Goethe) کی طرح اقبالؔ محض ایک مفکر یا مصلح قوم ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنی شاعری کی بدولت انسانوں کے دلوں پر بھی حکومت کرتے ہیں۔ محاسن مذکورہ بالا کے نہایت حسین امتزاج ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے کلام کی اپیل عالمگیر ہوگئی۔ یعنی موافق اور مخالف دونوں ان کے کلام سے یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

اس نظم میں محاسن شعری کے علاوہ تاریخ فلسفہ اور رجائیت کے عناصر بھی موجود ہیں، اقبالؔ نے اختصار کے ساتھ، مسلمانانِ اندلس کی تاریخ بھی بیان کردی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بھی کھینچ دیا ہے اور مسلمانوں کو ان کے شاندار مستقبل کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ ان تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں کی بنا پر اس نظم میں بے اندازہ جاذبیت اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ اس نظم میں آٹھ بند ہیں۔ اور ہر بند میں ایک مرکزی خیال پایا جاتا ہے۔ پہلے بند میں زمانہ کی حقیقت اور کار جہاں کی بے ثباتی بیان کی ہے۔ دوسرے بند میں عشق کی صفات واضح کی ہیں۔ یہ دو بند بطور تمہید لکھے ہیں۔ تیسرے بند میں مسجد قرطبہ سے خطاب کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس مسجد کی بنیاد عشق پر رکھی گئی تھی۔

چوتھے بند میں مسجد کی شان و شوکت کا تذکرہ ہے۔ اور ضمناً ملت اسلامیہ کی بقا کا مژدہ بھی سنایا ہے۔ پانچویں بند میں مرد مومن، کا تصور پیش کیا ہے۔ چھٹے بند عربوں کی فتوحات اور عظمت رفتہ کا بیان ہے۔ ساتویں بند میں یورپ کے بعض اہم انقلابات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آٹھویں بند میں شاعر نے الہامی رنگ میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی پیشگوئی کی ہے۔ اور آخری شعر میں اپنا فلسفہ پیغام کی صورت میں پیش کیا ہے، تاکہ اس نظم کا مقصد واضح ہوسکے۔

ممکنات کے لئے ''زیر وبم'' کا لفظ ساز ازل کی رعایت کے لئے لائے ہیں۔ مراد ہے ظہور ممکنات۔

چوتھا وار پانچواں شعر: زمانہ، بلاشبہ کائنات میں سب سے بڑا صیرفی یعنی کھرے کھوٹے کا پرکھنے والا ہے۔ چنانچہ جو افراد اور حادثات کم عیار یعنی ناقص اور کھوٹے ہوتے ہیں، زمانہ انہیں فراموش کر دیتا ہے۔

چھٹا شعر: اے مخاطب سلسلہء روز وشب کی حقیقت یا اصل زمان خالص ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات، نہ حال ہے نہ مستقبل بس یہ زمان خالص ایک رو (مرور) ہے جس میں کہیں سکون نہیں ہے

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے

دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

بالفاظ دگر، زمانہ زندگی ہے، اور زندگی ہی زمانہ ہے۔ لیکن اس راز کو سمجھنے کے لئے خودی کی معرفت لازمی ہے۔ جب تک ''عارفانہ نظر'' پیدا نہ ہو، زمانہ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

ساتواں شعر: چونکہ حوادث، یعنی معجزہ ہائے ہنر سب زمان ومکان میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے لازمی طور سے سب کے سب آنی اور فانی ہیں (جو آنی ہوگا وہ فانی بھی ہوگا) یعنی کار جہاں، یا کار خانہ عالم سراسر بے ثبات ہے۔

آٹھواں شعر: کائنات میں انسان کی بنائی ہوئی ہر شئے کی ابتدا نیستی سے ہوتی ہے اور انتہا بھی نیستی ہے۔ یعنی کسی نہ کسی دن وہ شئے ضرور مٹ جائے گی۔ یعنی اول اور آخر فنا ہے۔ اسی طرح ہر مادی شئے کا ظاہری پہلو بھی فانی ہے۔ اور باطنی پہلو بھی فانی ہے۔ اسی طرح ہر مادی شئے کا ظاہری پہلو بھی فانی ہے۔ اور باطنی پہلو بھی فانی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ کائنات میں انسان کی بنائی ہوئی ہر شئے کی خواہ وہ پرانی ہو یا نئی آخری منزل فنا ہے۔ لیکن اس نقش (آرٹ کا معجزہ) میں دوام کی صفت کی پائی جاتی ہے، جسے کسی مرد مومن نے پایۂ تکمیل کو پہونچایا ہو۔ کیونکہ مومن اس کام کو، عشق کی وساطت سے انجام دیتا ہے اور عشق چونکہ زمانِ مسلسل سے بالاتر اور جہات ستہ سے آزاد ہوتا ہے (اس کا تعلق زمان خالص سے ہوتا ہے) اس لئے

ے عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ خدا، خودی (روح) عشق اور زمانہ میں ایک ایسا مخفی ربط رکھا ہے، جو عقل کی گرفت سے بالاتر ہے اس کی حقیقت صرف عاشق کو معلوم ہو سکتی ہے۔

پہلے بند کو سمجھنے کے لئے صرف اس قدر ذہن نشیں کر لینا کافی ہے کہ:

(۱) زمانہ کی دو قسمیں ہیں، حقیقی زماں اور تسلسل زماں جو اول الذکر کی بدولت عالم وجود میں آتا ہے۔

(۲) حقیقی زماں کی ماہیت، روح کی طرح عقل کی گرفت سے بالاتر ہے وہ زندگی کی ایک شان ہے اور زندگی خود اس کی ایک شان (aspect) ہے۔ وہ زندگی میں پوشیدہ ہے اور زندگی اس میں پوشیدہ ہے۔ وہ زندگی سے ہے اور زندگی اس سے ہے۔

(۳) جب تک خودی کی معرفت حاصل نہ ہو، زمان حقیقی کی معرفت بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۴) زندگی زماں میں ایک مسلسل حرکت کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں زمانہ کی مسلسل حرکات کو زندگی کہتے ہیں۔

اس بند کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تمام واقعات اور حادثات زمان مسلسل (جو زمان خالص سے پیدا ہوتا ہے) ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ سلسلہء روز و شب یعنی زمان مسلسل، زندگی اور موت کی بنیاد ہے۔ بایں معنی کہ پیدا ہونا اور مر جانا، یہ تغیر کی نشانی ہے، اور تغیرات اور انقلابات سب اسی زمانہ کی حرکت مسلسل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ چونکہ تغیر اور انقلاب سے منزہ ہے اس لئے وہ زمان و مکان کی قید سے بھی بالاتر ہے۔

دوسرے شعر میں اقبالؔ نے سلسلہء روز شب کو تانے بانے سے تشبیہہ دی ہے جس سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے یعنی اللہ کی تمام صفات مثلاً پیدا کرنا، رزق دینا، مارنا زندہ کرنا وغیرہ، زمان و مکان ہی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تار حریر دو رنگ یعنی کالے اور سفید رنگ کے ریشم کا تار سفید سے دن مراد ہے اور کالے سے رات۔

تیسرے شعر میں اقبالؔ نے زمانہ کو ساز ازل کی فغاں سے تشبیہہ دی ہے یعنی زمانہ کیا ہے؟ ازل کے ساز سے ایک نغمہ نکل رہا ہے یعنی زمانہ اللہ کی تخلیقی فعالیت کا نام ہے اور تمام مخلوقات (ممکنات) جیسا کہ ہم جانتے ہیں، بقید زمان و مکان سے عالم وجود میں آتی ہیں۔

عشق، شریعت اسلامیہ کا سب سے بڑا محافظ اور شارح ہے اور عشق مجاہدوں کی فوج کا سردار ہے یعنی عشق ہی مومنوں کے دل میں جذبۂ جہاد پیدا کر دیتا ہے۔

عشق چونکہ ''ابن السبیل'' یعنی مسافر ہے۔ اس لئے اس کے ہزاروں مقامات ہیں۔ اقبالؔ نے عشق کو مسافر سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ عشق ہی کی بدولت، سالک روحانی منازل طے کرتا ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو زندگی کے ساز سے کوئی نغمہ برآمد نہ ہوتا یعنی زندگی ہی موجود نہ ہوتی نیز عشق ہی کی بدولت زندگی میں شان جمال اور شان جلال پائی جاتی ہے۔

تیسرا بند

اس بند میں اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کا وجود بھی عشق ہی پر منحصر ہے۔ یعنی جذبہ عشق ہی کی بدولت عرب ایسی شاندار مسجد تعمیر کر سکے۔ اور یہ جوہرا پنے اندر صفت دوام رکھتا ہے اس لئے زماں مسلسل کی گرفت سے بالاتر ہے۔ وجہ ہے کہ اگر چہ مسلمان، آج ہسپانیہ میں موجود نہیں ہیں، لیکن ان کی ثقافت کا یہ عظیم الشان کارنامہ آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصوری، تعمیر، موسیقی، شاعری اور خطاطی، ان تمام فنون لطیفہ کا وجود عشق پر موقوف ہے۔ خون جگر سے یہاں جذبہء عشق مراد ہے۔

صاحب فن کا خلوص یا جذبہء عشق غیر ذی روح اشیاء میں زندگی کی شان پیدا کر دیتا ہے اور اس خلوص یا عشق ہی کی بدولت، آواز میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے یعنی موسیقی میں جو سوز و گداز پایا جاتا ہے اس کی اصل نے نواز کا دل ہے، نہ کہ لکڑی کا بنا ہوا ساز۔ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ مسجد اور میری شاعری، دونوں خلوص پر مبنی ہیں اس لئے اگر مسجد کی فضا دل فیروز ہے تو میرا کلام بھی دل گداز ہے۔ اگر مسجد کا نظارہ ناظر کے دل میں اللہ کی ہستی کا یقین پیدا کرتا ہے تو میرے کلام کے مطالعہ سے بھی قلب میں محبت الٰہی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر چہ مومن کا جسم مادی ہوتا ہے۔ لیکن اس کا دل عرش معلیٰ سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں خدا کی محبت جاگزیں ہوتی ہے۔ اور اس جذبۂ عشق ہی کی بدولت انسانوں کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ فرشتے بھی اگر چہ اللہ کی حمد وثنا کرتے ہیں۔ لیکن ان میں عشق کا جذبہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ اس مسجد کو دیکھ کر میرے دل میں عشق الٰہی کی آگ اور بھی تیز ہوگئی اور میری زبان پر بے اختیار درود اور سلام جاری ہوگیا۔ چنانچہ یہ نظم اسی والہانہ کیفیت کی آئینہ دار ہے۔

زمانِ مسلسل، اس کے کارناموں کو فنا نہیں کر سکتا۔

دوسرا بند

اس بند میں اقبالؔ نے عشق کی صفات بیان کی ہیں

عشق، مومن کے اعمال و افعال میں رنگِ دوام کر دیتا ہے اور چونکہ عشق، اصل حیات ہے اس لئے اس پر فنا طاری نہیں ہو سکتی۔ زمانہ اگرچہ بمنزلہ سیل ہے، لیکن عشق خود اس سے بڑھ کر سیل ہے۔ اس لئے وہ زمانہ پر غالب آجاتا ہے اور اس کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

عشق، زمانہ کا بڑی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ زمانہ ہر شئے کو ہلاک کر دیتا ہے لیکن عشق اور اس کے کارناموں پر اس کا قابو نہیں چلتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق بلحاظِ ذاتِ خویش، زمانہ کی دستبرد سے بالاتر ہے۔

عشق میں جاودانی یعنی ابدیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی تقویم میں عصرِ رواں کے علاوہ اور بہت سے (زمانے) اعصار بھی ہیں، جن سے دنیا والے واقف نہیں ہیں۔ اسی لئے ہماری زبان میں ان کے نام وضع نہیں کیے گئے۔

عشق کوئی مادی یا دنیاوی یعنی کثیف شئے نہیں ہے۔ بلکہ نہایت پاکیزہ اور روحانی بلکہ آسمانی جوہر ہے، اس حقیقت کو اقبالؔ نے دمِ جبرئیل، اور دل مصطفےٰ سے واضح کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عشق کی عظمت، رفعت، پاکیزگی، طہارت اور روحانیت کے اظہار کے لئے، ان دوناموں سے بڑھ کر کوئی نام ذہن میں نہیں آسکتا۔ دوسرے مصرع میں اقبالؔ نے، پہلے مصرع کا مطلب بیان کیا ہے۔ یعنی خدا کے رسول سے مراد دلِ مصطفےٰ ہے۔ اور خدا کے کلام سے مراد دمِ جبرئیل ہے۔

کہتے ہیں کہ مٹی کے پتلے، یعنی انسان میں جو یہ تابناکی، یہ چمک دمک، یہ روشنی اور یہ روحانیت نظر آتی ہے، یہ سب عشق ہی کا کرشمہ ہے۔

"کاس الکرام" کے لغوی معنی ہیں، فراخدل اور سخی، مے نوشی کا پیالہ جس سے دوسرے بھی سیراب ہوتے ہیں۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ عشق وہ شراب ہے جس کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے اور عشق وہ پیالہ ہے جس سے ہر شخص کو فیض پہونچتا ہے۔ یعنی عاشق کا وجود، دنیا والوں کے حق میں باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

ایزدی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جس کی بدولت اس کے اندر غلبہ کار آفرینی کار کشائی اور کارسازی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

مومن، اپنے جسم کے لحاظ سے بیشک خاکی ہوتا ہے لیکن روح کے لحاظ سے نوری ہوتا ہے عشق رسول صلعم کی بدولت اس میں خدائی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کا دل دونوں جہان سے غنی ہو تا ہے۔ وہ محض اللہ کی خوشنودی کا طلب گار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا اور دنیا والوں سے کسی قسم کی توقعات نہیں رکھتا اس کا بھروسہ صرف اللہ پر ہوتا ہے اور اس کا نصب العین بہت بلند ہوتا ہے۔ اس کی طرز زندگی میں دل کشی اور نگاہوں میں دلنوازی کی شان پائی جاتی ہے۔

مومن کی گفتگو میں نرمی اور محبت کا رنگ ہوتا ہے جب وہ میدان جنگ میں جاتا ہے تو سراپا جدوجہد بن جاتا ہے لیکن ان دونوں حالتوں میں (خواہ وہ مجلس احباب میں ہو خواہ میدان جہاد ہیں) پاک طینت اور پاکباز ہوتا ہے۔ مومن اپنے یقین کی بدولت دنیا میں حق وصداقت کی تبلیغ کرتا ہے اور اس کے یقین ہی کی بدولت دنیا میں حق کو ثبات حاصل ہوتا ہے نیز اس دنیا میں صرف اس کا یقین ایک ایسی شئے ہے جسے حق کہہ سکتے ہیں۔ باقی یہ تمام دنیا بے حقیقت عارضی اور فانی شئے ہے۔ وہم سے یہاں وہ شئے مراد ہے جس کی کوئی اصلیت (قیمت) نہ ہو۔

طلسم سے وہ شئے مراد ہے جس کا ظاہر کچھ ہو، باطن کچھ ہو یعنی دھوکہ مجاز سے وہ شئے مراد ہے جس کی کوئی حقیقت (بنیاد) نہ ہو۔ وہم یقین کی ضد ہے طلسم صداقت کی ضد ہے، اور مجاز حقیقت کی ضد ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مومن میں عقل اور عشق دونوں صفات اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور اس دنیا کی ساری رونق اور شان وشوکت اسی کے دم سے وابستہ ہے۔

چھٹا بند:

اس بند میں اقبال نے پہلے دو شعروں میں مسجد کی تعریف کی ہے پھر اس مسجد کے بنانے والوں کی عظمت اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اے مسجد! تو فنون لطیفہ کے ماہروں کی نظر میں ایسی ہی لائق احترام ہے جیسے کعبہ مسلمانوں کی نظر میں تجھ کو دیکھ کر اسلام کی عظمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور تیری بدولت ہسپانیہ کی سرزمین بھی مکہ معظّمہ کی طرح محترم اور معزز ہوگئی۔

چوتھا بند

اے مسجد قرطبہ! تیری شان جلال و جمال اس بات کا ثبوت کہ تجھے کسی مرد مومن نے تعمیر کیا تھا، جس طرح تو جلیل و جمیل ہے اسی طرح وہ بھی صاحب جلال و جمال تھا تیری بنیاد نہایت مستحکم ہے اور تیرے اندر بے شمار ستون ہیں (اس مسجد میں ۱۴۱۷ استون ہیں) ان ستونوں کو شام کے نخلستان میں کھجوروں کے درخت سے تشبیہہ دی ہے۔

تیرے در و بام پر نور برس رہا ہے۔ اور تیرا یہ مینار (جو ایک سو دس فٹ بلند ہے) جبرئیل کی جلوہ گاہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اس پر برکات سماوی کا نزول ہوتا ہے

مسجد کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد اقبالؔ کا ذہن مسلمان قوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اے مسجد! تجھے دیکھ کر میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ مسلمان اگرچہ ہسپانیہ سے مٹ گیا۔ لیکن دنیا سے ہرگز نہیں مٹ سکتا۔ کیونکہ وہ اس عالم میں حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم کی شریعت کا پاسباں اور اسلامی روایات کا محافظ ہے۔

اس مصرع میں سلطنت عثمانیہ کی وسعت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ سلطان سلیمان اعظم کے زمانے میں یہ تینوں دریا سلطنت عثمانیہ میں شامل تھے۔ دریائے دجلہ عراق میں ہے۔ دریائے ڈینوب، وسط یورپ میں اور دریائے نیل مصر میں ہے۔

مسلمانوں کی ملی تاریخ حیرت انگیز کارناموں سے بھری ہوئی ہے انہوں نے اپنے زمانہ عروج میں، دنیا کے تمام علوم و فنون میں اس قدر ترقی کی تھی کہ دنیا کی تاریخ میں نئے دور کا افتتاح ہو گیا۔

پانچواں بند۔

اس بند میں اقبالؔ مرد مومن کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔

مسلمان جب عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اپنے اندر شان فقر پیدا کر لیتا ہے تو اس کی زندگی میں انقلاب عظیم رونما ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ نے اس بند میں اسی انقلاب کی تصویر کھینچی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس مسجد کو دیکھ کر مومن کی شان سمجھ میں آسکتی ہے۔ اور اس کے قلب کے سوز و گداز، اس کی بلندئ خیال اور اس کے جذبہ عشق و مستی کا تصور ذہن میں قائم ہو سکتا ہے۔

جب مومن میں شان فقر پیدا ہو جاتی ہے، تو اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے یعنی اس میں صفات

کی ہمراہی میں اس ملک کو فتح کیا تھا۔

ان لوگوں کی طرز حکومت سے یہ حقیقت واضح ہوسکتی ہے کہ سچے مسلمان کی شاہی میں بھی فقر کا رنگ پایا جاتا ہے یعنی مومن کی حکومت انسانوں کے حق میں باعث رحمت ہوتی ہے۔

ان لوگوں نے ، یعنی عربوں نے مشرق اور مغرب کو اسلام کے نور سے منور کر دیا اور انہی کی بدولت یورپ میں جوان کی آمد سے قبل جہالت اور اوہام باطلہ کی تاریکی میں مبتلا تھا علم وفن کی روشنی پھیل گئی چنانچہ یورپ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس خط میں علوم وفنون کی اشاعت عربوں ہی کی وساطت سے ہوئی۔ قرطبہ اور غرناطہ کے مدرسوں میں انگلستان فرانس جرمنی اور اطالیہ کے طلبہ مختلف علوم و فنون حاصل کرتے تھے۔ فرانس اور اطالیہ میں تو فلسفۂ ابن رشد کے مرکز قائم تھے جہاں سے اس نامور حکیم کے فلسفہ کی باقاعدہ اشاعت ہوتی تھی۔

آج بھی ہسپانیہ کے باشندوں میں عربی خون کی آمیزش کی وجہ سے خوش مزاجی مہمان نوازی ، ادہ ولی اور حسن ظاہری کا رنگ پایا جاتا ہے۔ آج بھی اندلس کی ہوا میں یمن کی خوشبو، اور وہاں کے باشندوں کی گفتگو میں حجازی لب ولہجہ کا اثر موجود ہے۔

ساتواں بند:

پہلے شعر میں مسجد سے خطاب ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں تیزی زمین آسمان کی ہم پلہ ہے لیکن افسوس ہے کہ صدیوں سے تیرے صحن میں نماز نہیں ہوئی ، اور تیرے مینارہ سے اذان کی آواز بلند نہیں ہوئی۔

دوسرے شعر سے پھر اقبالؔ اپنے جذبات کا اظہار شروع کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خدا معلوم اب تک اندلس میں انقلاب کیوں نہیں برپا ہوا؟ جب انقلاب اس جہان کا آئین ہے تو خدا معلوم ابھی تک یہ سرزمین بلالی پرچم سے کیوں محروم ہے۔

اس کے بعد چار شعروں میں اقبالؔ نے کمال بلاغت کے ساتھ یورپ کے بڑے بڑے انقلابات کا ذکر کیا ہے جوان قیاس کے مؤید ہیں یعنی جب جرمنی فرانس اور اطالیہ میں انقلاب رونما ہو چکا ہے؟ تو اگر ہسپانیہ میں بھی عنقریب کوئی انقلاب رونما ہو جائے تو بعید از قیاس نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ زوال غرناطہ کے بعد یورپ میں بہت سے انقلاب رونما ہو چکے ہیں مثلاً سولہویں

تیرے حسن و جمال کی نظیر اس دنیا میں اگر کہیں مل سکتی ہے تو وہ صرف قلب مومن ہے واضح ہو کہ اقبالؔ نے مسجد کو قلب مومن سے تشبیہہ دے کر دو باتیں ثابت کی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ مومن کا دل حسن و جمال کا مرکز اور منبع ہوتا ہے (مومن کے دل کو منبع حسن و جمال قرار دینا اقبال کی ندرت فکر کا کمال ہے دوسری بات یہ کہ دنیا کی کوئی مسجد حسن و جمال کے اعتبار سے، جامع قرطبہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مسجد کا ذکر کرتے کرتے اقبالؔ کا ذہن قدرتی طور پر اس قوم کے کارناموں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس نے یہ عدیم المثال مسجد بنائی تھی چنانچہ اس بند کے تیسرے شعر سے آخر تک انہوں نے عربوں کی عظمت رفتہ کی داستان بیان کی ہے۔ چونکہ اقبالؔ کو یہ معلوم تھا کہ وہ چار چھ شعروں میں ہسپانیہ کی تاریخ نظم نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے رنگ اختصار کو مدنظر رکھ کر اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن میں مسلمانانِ اندلس کی چھ سو سال کی تاریخ مضمر ہے اسی لئے ان چھ شعروں کے پڑھنے سے دل میں اثر پیدا ہو سکتا ہے، جو پوری تاریخ پڑھنے سے بھی شاید نہ ہو سکے۔

مثال کے طور پر پہلے شعر کے الفاظ پر غور کیجئے۔

اقبالؔ نے اس شعر کو لفظ آہ سے شروع کیا ہے۔ یہ لفظ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ مسلمانانِ اندلس کی تاریخ ایک دردناک المیہ (ٹریجیڈی) ہے یعنی ان کی پوری تاریخ اس ایک لفظ میں پوشیدہ ہے۔

''مردانِ حق'' کی ترکیب یہ بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے ہسپانیہ کو فتح کیا تھا، یعنی طارق اور ان کے ہمراہی، وہ سچے مسلمان تھے ان کے زندگی کا مقصد یہ تھا کہ حق کا بول بالا ہو۔

''عربی شہسوار'' کی ترکیب یہ بتاتی ہے کہ وہ لوگ عربی النسل تھے اور شہسواری میں ممتاز تھے بلکہ یہ ان کی قومی خصوصیت تھی علاوہ بریں اس لفظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہسپانیہ میں تجارت کرنے کے بہانے سے داخل نہیں ہوئے تھے، بلکہ انہوں نے اس ملک پر فوج کشی کی تھی۔

''خلق عظیم'' اقبالؔ نے یہ ترکیب قرآن کریم سے مستعار لی ہے اسی لئے اس کو دادین (com as) میں لکھا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا ہے۔

وانك لعلى خلق عظيم یعنی یقیناً آپ بہت بلند اخلاق رکھتے ہیں حامل خلق عظیم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ بھی چونکہ سچے مسلمان تھے۔ اس لئے بلند اخلاق کے مالک تھے۔

صاحب صدق و یقیں، یہ ترکیب بھی ان عربوں کی سیرت کو واضح کرتی ہے جنہوں نے طارق

نہیں ہے۔دوسرے مصرع میں استعارہ بالکنایہ نے شعر کو آسمان پر پہونچادیا ہے۔شاعر نے پہلے آفتاب کو ایک تاجر قرار دیا پھر اس کے لئے "لعل بدخشاں کے ڈھیر ثابت کئے اسی طرح دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں دل کو کشتی تصور کر کے پھر عہد شباب کو کشتی دل کے لئے بمنزلہ سیلاب قرار دیا۔ یہ کتنا دلکش انداز بیان ہے، اس حقیقت کے اظہار کے لئے کہ جوانی میں دل پر قابو نہیں رہ سکتا۔ یہ ظالم کسی نہ کسی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو ہی جاتا ہے۔

شام کا وقت ہے، آفتاب ابھی غروب ہوا ہے دہقان کی لڑکی گیت گاتی ہوئی گھر واپس جارہی ہے شاعر عالم خیال میں دریا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے دریا! تجھے کیا خبر کہ کوئی شخص تیرے کنارے آئندہ زمانہ کا خواب دیکھ رہا ہے! میں جس آنے والے زمانے کا تصور کر رہا ہوں وہ اگرچہ ابھی دنیا کی نگاہوں سے پوشدہ ہے۔لیکن میں اس کے آغاز کو دیکھ رہا ہوں اگر میں آنے والے انقلاب کی تفصیلی بیان کروں تو یورپین اقوام اس پر یقین نہیں کریں گی اس لئے میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔

اس کے بعد شاعر مسلمانوں سے خطاب کرتا ہے کہ زندگی انقلاب کا دوسرا نام ہے جس قوم کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کی آرزو نہ ہو، اس کا شمار زندہ اقوام میں نہیں کیا جاسکتا قوموں کی زندگی صرف انقلاب پیدا کر سکنے پر منحصر ہے۔ جو قوم ہر وقت اپنے اعمال کا جائزہ لیتی رہتی ہے اور انقلاب برپا کرنے کی تیاری کرتی رہتی ہے، وہی قوم دست قضا میں شمشیر بنتی ہے یعنی خدا اسی قوم کو اقوام عالم کی سرداری عطا فرماتا ہے۔

اس بند کا آخری شعر پوری نظم کی جان ہے کیونکہ اس میں اقبال نے اپنا فلسفہء جسے ان کے پیغام کی روح سے تعبیر کر سکتے ہیں، بیان کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مدتوں کی ترقی دو باتوں پر موقوف ہے پہلی بات یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی نصب العین ضرور ہونا چاہئے جو قوم اپنا مقصد حیات، متعین نہیں کرتی اس کی زندگی بالکل بے معنی ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس نصب العین کے حصول کا جذبہ عشق کے درجہ پر پہونچ جائے۔ کیونکہ عشق کے بغیر سب ارادے ناتمام رہتے ہیں۔ اسکے بغیر کوئی قوم اپنی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

خلاصہءکلام یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے انہیں اس حقیقت کو ذہن نشین ک لینا چاہیے کہ انقلاب آئین حیات ہے۔ اور مسلمانوں کو انقلاب برپا کرنے کی تیاری کرنی چاہئے

صدی میں جرمنی میں لوتھر نے اصلاح کلیسائے روم کے نام سے ایک تحریک شروع کی، جس نے یورپ میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا جس کی بدولت نصف سے زائد مسیحی دنیا پاپائے روم کے مذہبی اقتدار سے آزاد ہوگئی۔

نیز اس اصلاح (Reformation) کا ایک زبردست نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پیر کنشت کی عصمت کا عقیدہ باطل ہوگیا یعنی جو ممالک مثلاً جرمنی، انگلستان، پاپائے روم کے اقتدار سے آزاد ہوگئے ہیں وہاں کے عیسائی اس کو معصوم نہیں سمجھتے۔ واضح ہو کہ کلیسائے روم یعنی رومن کیتھولک چرچ کا یہ عقیدہ ہے کہ یورپ معصوم عن الخطا ہے۔ اس سے غلطی یا گناہ سرزد نہیں ہوسکتا۔ لوتھر نے اس عقیدے کا ابطال کیا جس کی بدولت پروٹسٹنٹ کلیسا کے پادریوں کو بائبل میں غور وفکر کرنے اور اس کی تفسیر لکھنے کی آزادی نصیب ہوئی۔

رومن کیتھولک دنیا میں کوئی مذہبی یا فلسفیانہ یا علمی کتاب شائع نہیں کرسکتا۔ جب تک کلیسا، اس کے مضامین کی صحت کی تصدیق نہ کردے اس کام کے لئے پوپ کی طرف سے احتساب کتب کا ایک باقاعدہ محکمہ قائم ہے۔

اسی طرح اٹھارہویں صدی میں بھی عظیم الشان انقلاب برپا ہوا۔ جس کا نام ہی انقلاب فرانس ہے۔ اس کی مفصل تاریخ کارلائل () نے انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ اس انقلاب سے اہل مغرب کی دنیا ہی بدل گئی کیونکہ اس انقلاب کی بدولت یورپ کی قومیں حریت، اخوت اور مساوات کے الفاظ سے آشنا ہوئیں شاید کبھی مفہوم سے بھی آگاہ ہوجائیں۔

اسی طرح اطالوی قوم بھی جو عرصہ دراز سے قدامت پرستی میں مبتلا تھی تجدید واصطلاح حال کی بدولت از سر نو طاقتور ہوگئی ہے۔

ایسے حالات میں اگر عربوں یا مسلمانوں میں بھی کوئی ایسا انقلاب رونما ہوجائے جس کی بنا پر ان کی زندگی پیدا ہوجائے تو بعید از قیاس نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانان عالم میں جو ایک عام اضطرابی کیفیت پائی جاتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جلد یا بدیر ان میں بھی انقلاب برپا ہوگا۔ اس لئے اقبالؔ منتظر ہیں کہ دیکھئے پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے اور آسمان آئندہ کیا رنگ بدلتا ہے۔

آٹھواں بند: اس آخری بند کا پہلا شعر، فنی اعتبار سے بے نظیر ہے۔ ساری نظم میں اس کا جواب

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو!
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو!

خلاصہ

یہ پر سوز، پر کیف اور پر تاثیر دعا، اقبالؔ نے مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ پہلے تین شعروں میں دعا کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اس کے بعد چار شعر، حمد و ثناء کے رنگ میں ہیں پھر دو شعروں میں دعا کی ہے اور ایک شعر میں گلہ کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی در پردہ دعا ہی ہے۔ آخر میں شعر کی حقیقت بیان کی ہے۔ چونکہ یہ نظم ایک خاص ماحول میں اور خاص جذبہ کے تحت لکھی گئی ہے اس لئے اس کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے کے دل میں بھی اسی قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اقبالؔ کی شاعری، سراسر رمز و کنایہ سے معمور ہے اور اس قسم کے اشعار کی خصوصیت یہ ہے کہ بظاہر مطلب کچھ ہوتا ہے لیکن بہ باطن شاعر کی مراد کچھ اور ہوتی ہے۔ بالفاظ اگر، ایمائی اشعار کا ظاہری مطلب جہاں ختم ہوتا ہے، دراصل حقیقی مفہوم وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات بال جبرئیل ہی سے مختص نہیں ہے، اقبالؔ کی ہر تصنیف میں یہی رنگ پایا جاتا ہے۔

پہلا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ نماز بروئے شریعت سب سے بڑی عبادت ہے اور عبات کا مغز دعا ہے لیکن دعا کی شرط یہ ہے کہ اس میں خلوص کا رنگ ہو یعنی دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ اس طرح کہ اس میں دعا کرنے والے کے جگر کا خون یعنی عشق کا رنگ منعکس ہو۔

''خون جگر'' اقبالؔ کی خاص اصطلاح ہے اور اس سے ان کی مراد عشق یا ''خلوص قلب'' ہوتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ لیکن یہ خلوص یہ رنگ فدویت یہ تضرع، اور خضوع و خشوع اہل صفا یعنی عشاق کی صحبت ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ صحبت مرشد کے بغیر، انسان للّٰہیت اور خلوص کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

گل لالہ میں دلکشی اور رعنائی، حسن اور زیبائی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ آبجو کے قریب

اوراس کی صورت ایک ہی ہے یعنی وہ اپنے اندر عشق کا جذبہ پیدا کرلیں نصب العین کا حصول اسی جذبہ پر موقوف ہے۔

دعا

(مسجد قرطبہ میں لکھی گئی)

ڈاکٹر علامہ اقبالؔ

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو!

صحبتِ اہلِ صفا، نور و حضور و سرور
سرخوش و پر سوز ہے لالہ لبِ آبجو!

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی، ایک مری آرزو!

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر!
میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو!

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ھو!

تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو!

پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام
تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو!

پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر، کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو!

چشم کرم ساقیا، دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو!

دسواں شعر:۔اے خدا! میں بڑے ادب کے ساتھ تیری جناب میں عرض کرتا ہوں کہ میرا جذبۂ محبت، زمان ومکان کی قید گوارا نہیں کرسکتا۔اس لئے تو اپنے فضل وکرم سے مجھ میں بھی لامکانی کی صفت پیدا کردے۔چونکہ اقبالؔ کی رائے میں خودی کا کمال یہ ہے کہ وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے ہر کتاب میں مسلمانوں کو اسی نصب العین کے حصول کی تلقین کی ہے۔اور خود بھی اس نظم میں اللہ سے اسی دولت عظمیٰ کے حصول کی دعا کی ہے

گیارھواں شعر: آخری شعر میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ میں نے اللہ سے جو دعا کی ہے، اس میں اپنے جذبات قلبی کی عکاسی مکمل طور سے نہیں کی ہے کیونکہ میں نے یہ دعا نثر میں نہیں کی ہے، بلکہ شعر کی صورت میں کی ہے اور شاعری اور فلسفہ کی حقیقت یہ ہے کہ شاعر اور فلسفی ،اپنے خیالات کو واشگاف بیان نہیں کرتا محض اس لئے کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا۔یعنی فلسفہ اور شعر کی خوبی رمز وایماء میں مضمر ہے چنانچہ دنیا کے تمام بڑے بڑے شعراء نے اسی صفت کی بدولت اپنی شاعری میں دلکشی کا رنگ پیدا کیا ہے۔

ساقی نامہ

ڈاکٹر علامہ اقبالؔ

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار!
گل ونرگس وسوسن ونسترن!
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن!
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں!
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی!
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی!
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ!
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ!
ذرا دیکھ اسے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام!
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز!
وہ مئے جس سے روشن ضمیر حیات!
وہ مئے جس سے ہے مستیٔ کائنات!

ہوتا ہے۔اسی طرح انسان میں سرخوشی ، اور سوز و گداز اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ مرشد کی صحبت اختیار کرتا ہے ۔جس طرح پانی پھولوں کی آبیاری ہے اسی طرح مرشد کی نگاہ دل کو تروتازہ کرتی ہے۔

تیسرا شعر: پس دعاء میں اس وقت خلوص پیدا ہوسکتا ہے، جب انسان اللہ کے عشق میں فنا ہو جائے لیکن اس راستہ میں نہ دوست کام آسکتا ہے نہ کوئی عزیز مدد کرسکتا ہے۔عاشق کو یہ راہ اپنی ذاتی کو شش اور ہمت سے طے کرنی پڑتی ہے۔ہاں اس راہ میں اگر کوئی رفیق ہوسکتا ہے تو وہ عاشق کا جذبۂ عشق ہی ہے، جو آخرتک اس کا ساتھ دے سکتا ہے، اسی جذبۂ عشق کو اقبال نے ''آرزو'' سے تعبیر کیا ہے۔

چوتھا شعر: دعا کی حقیقت واضح کرنے کے بعد، اب اقبال اللہ سے خطاب کرتے ہیں کہ اے رب کریم! میں تیرا ایک عاجز بندہ ہوں۔اور دنیا میں تیرے سوا کسی کو اپنا دست گیر اور حاجت روا نہیں سمجھتا ۔میرا نشیمن بھی تو ہی ہے اور شاخِ نشیمن بھی تو ہی ہے۔یعنی میں صرف تجھ ہی پر تکیہ کرتا ہوں ، اور اس تکیہ کی توفیق بھی تجھی سے طلب کرتا ہوں۔میں صرف تجھی کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتا ہوں اور یہ سمجھ جو مجھ میں پیدا ہوئی ہے یہ بھی تیری ہی پیدا کروہ ہے۔

پانچواں شعر: تیری ہی مہربانی سے میرے اندر عشق کا یہ رنگ پیدا ہوا ہے۔تیری ہی محبت کی بدولت میرے سینہ میں قیامت کا سا ہنگامہ برپا ہے۔تیرے ہی عشق کی آگ میرے دل میں بھڑک رہی ہے، تیری ہی یاد میں ''اللہ ہو'' کا نعرہ میرے لبوں سے نکل رہا ہے۔

چھٹا اور ساتواں شعر: میری زندگی میں تیری ہی محبت کی بدولت سوز و گداز اور سرمستی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔تو ہی میرا مقصود اور مطلوب ہے اور تجھ کو حاصل کرنا ہی میری زندگی کا نصب العین ہے۔اگر مجھے تیری قربت اور سنگت نصیب ہو جائے تو ویرانہ میں آبادی کا لطف حاصل ہوسکتا ہے لیکن اگر یہ نعمت مجھے نصیب نہ ہو تو ، پھر ساری دنیا میرے لئے ہیچ ہے۔

آٹھواں شعر: اے خدا! میں بڑی ندامت کے ساتھ اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں کہ تو نے تو اپنے فضل و کرم سے مجھ کو دولت ایمان عطا فرمادی تھی مگر میں نے کوتاہی عمل کی بنا پر اسے ضائع کر دیا۔ لیکن اب مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہے اس لئے تو پھر مجھ کو عشق رسولؐ کی دولت عطا فرمادے۔اور اے میرے مولیٰ کریم میں اس دعا میں اپنی قوم کے تمام افراد کو شریک کرتا ہوں وہ لوگ جو امور دنیاوی میں مشغول ہیں اور وہ جو عزلت گزیں ہیں۔سب تیری نگاہِ کرم کے منتظر ہیں۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

امنگیں مری آرزوئیں مری
اُمیدیں مری جستجوئیں مری

مری فطرت، آئینہ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغ زار

مرا دل، مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کا لشکر یقیں کا ثبات

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

دمادم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل
خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی!
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی!

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر!
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر!

یہ عالم، یہ بتخانہ شش جہات!
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات!

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں

چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے

اسی کے بیاباں، اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے، اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سی کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور!

کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

وہ مئے جس میں ہے سوز و ساز ازل! وہ مئے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل!
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے!

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ!
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!
گیا دور سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!
دل طورِ سینا و فاراں دو نیم تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم!
مسلماں ہے توحید میں گرمجوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش!
تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھو گئی!
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب مگر لذتِ شوق سے بے نصیب!
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شراب کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر تمنا کو سینوں میں بیدار کر

سبک اسکے ہاتھوں میں سنگِ گراں!
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے!

کرن چاند میں ہے، شرر سنگ میں
یہ بیرنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے!

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سی جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

فروفالِ محمود سے در گزر
خودی کو نگہ رکھ، ایازی نہ کر

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

یہ عالم، یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

یہ عالم، یہ بتخانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں

تیری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر!

خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید!
زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید!

جہاں اور بھی ہیں، ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصدِ گردشِ روز گار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت!
تجھے کیا بتاؤں تری سر نوشت!

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ!
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ!

فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تاب گفتار کہتی ہے بس!

کبوتر کہیں آشیانے سے دور!
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور!

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات   تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود   کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی   فقط رازِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند   سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز   سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے   تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا   کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں   رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج   اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے   اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات   ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز طوفان بڑی زود رس   ازل سے ابد تک دم یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے!   خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے!
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات!   خودی کیا ہے؟ بیدارئ کائنات!
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند!   سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک   من و تو میں پیدا من و تو سے پاک!
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے!   نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے!
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی   ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی   دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

کا انداز بیان مشکل ہے۔ بال جبرئیل لکھتے وقت ان کو خود یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مسئلے کو آسان طریقے پر اردو زبان میں بھی بیان کر دیا جائے، چنانچہ جو بات انہوں نے اسرار خودی گلشن راز جدید اور خطبات مدراس میں مشکل انداز میں کہی تھی، اسی کو انہوں نے اس نظم میں بہت آسان لفظوں میں واضح کر دیا اور چونکہ سمجھانا مقصود ہے اس لئے حقیقت یا ماہیت کی بحث کرنے کے بجائے، ایک تشبیہ کے ذریعے اپنا مفہوم عیاں کر دیا ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ نظم مسجد قرطبہ کی طرح اس میں بھی بلاغت کا رنگ نمایاں ہے مثلاً

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتان، عجم کے پجاری تمام

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخری بند میں اقبال نے شاعرانہ زور بیان کے علاوہ اپنے پیغام کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ ان کا پیغام اس قدر حوصلہ افزا اور امید افزا ہے کہ اگر اسے نثر میں بیان کیا جائے تو بھی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے لیکن یہاں اس نظم میں تو جوش بیان کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ فی الجملہ محاسن شعری اور نفسِ مضامین دونوں کے لحاظ سے ساقی نامہ کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔

پہلا بند۔

ملک یمن کے نزدیک قدیم زمانہ میں ایک شہر تھا جس میں شداد بن عاد نے بہشت ارضی بنائی تھی۔ اسے باغِ ارم کہا جاتا ہے۔ کثرتِ استعمال سے صرف ارم رہ گیا جس کے معنی خوبصورت باغ کے ہو گئے۔

مئے پردہ سوز۔ ایسی شراب جو پردوں کو جلا دے، مراد ہے شرابِ عرفان یا شراب معرفت، پردوں سے مراد ہیں وہ حجابات جو انسانی عقل اور حقیقت کے درمیان حائل ہیں۔

اقبال نے اس بند میں پہلے تو بہار کا منظر پیش کیا ہے اس کے بعد خدا سے یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنی محبت عطا فرما کیونکہ اسی کی بدولت انسان، حقائق کائنات سے آگاہ ہو سکتا ہے اور اس پر

اگر یک سیر موے بر تر پرم
فروغ تجلی بسوز د پرم!

خلاصہ

تمہید: ساقی نامہ محاسن صوری و معنوی، دونوں کے اعتبار اقبال کی بہترین اردو نظموں میں سے ہے۔ اس طویل نظم میں سات بند ہیں۔

پہلے بند میں شاعر نے بطور تمہید موسم بہار کے مناظر کی تصویر کھینچی ہے۔ دوسرے بند میں حالاتِ حاضرہ اور مسلمانان عالم کی موجودہ حالت پر تبصرہ کیا ہے۔ تیسرے بند میں شاعر نے نوجوانانِ ملت کے حق میں ساقی (اللہ) سے دعائیں کی ہیں۔ چوتھے بند میں زندگی کی، ماہیت بیان کی ہے۔ پانچویں بند میں زندگی کی خصوصیات واضح کی ہیں۔ چھٹے بند میں خودی کی ماہیت بیان کی ہے۔ ساتویں بند میں خودی کی صفات واضح کی ہیں۔ اور آخر میں انسان سے خطاب کیا ہے اور یہی حصہ اس نظم کی ''جان'' ہے کیونکہ انہوں نے اپنا فلسفہ اور پیغام دونوں باتوں کو ان چند اشعار میں قلم بند کر دیا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر معمولی سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ساری نظم میں کہیں آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ اول سے آخر تک آمد ہی آمد ہے۔ اس کو تنہائی میں غور سے پڑھا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نظم لکھتے وقت اقبال پر فیضانِ سماوی کا نزول ہو رہا تھا اس نظم کو پڑھ کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ الشعرآء تلامیذ الرحمٰن یعنی شعراللہ کے شاگرد ہوتے ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ نظم گوناگوں محاسنِ شاعری کی حامل ہے مثلاً پہلے بند میں منظر کشی کا کمال دکھایا ہے تو دوسرے بند میں انتہائی بلاغت کی شان پائی جاتی ہے۔ تیسرے بند میں جذبات نگاری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ چوتھے میں بند فلسفہ اور حکمت کے دریا بہا دئے ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ساری نظم اول سے آخر تک شاعر کے خلوص اور سوز جگر کی آئینہ دار ہے۔ ناممکن ہے کوئی شخص توجہ کے ساتھ تیسرے بند کو پڑھے اور اس خصوصیت کا اعتراف نہ کرے۔ بلاشبہ اقبال نے جو دعا کی ہے اس کا ہر لفظ ان کی دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس نظم میں اقبال نے حیات اور خودی کے مسائل کو آسان واضح اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

اقبال نے خودی کی وضاحت، فلسفیانہ انداز سے اپنی کتاب تشکیل جدید میں بھی کی ہے لیکن اس

شریعت، عقاید، عبادات اور معاملات کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں بھی علمائے نے بعض غیر اسلامی باتیں داخل کر دیں مثلاً اسلام میں ملوکیت رہبانیت اور سرمایہ داری بلکہ جاگیرداری کا جواز وغیرہ۔

کلام سے وہ فن مراد ہے جس کی مدد سے سائنس اور فلسفہ کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت ثابت کی جاتی ہے اس فن میں بھی رفتہ رفتہ بعض غیر قرآنی عقائد اور اکثر غیر اسلامی مسائل راہ پا گئے اور مسلمانوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں کو بلا وجہ اور بے سود ان مسائل میں ضائع کر دیا ہے، مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے یہی چار نمایاں پہلو ہیں۔ علماء نے ان چاروں سرچشموں کو اپنی غفلت یا کوتاہ بینی کی کی بدولت کثیف اور مکدر کر دیا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی حقانیت اور صداقت خرافات کے پردوں میں چھپ گئی۔ اور قوم۔ ''کشتہ ملا و پیر'' قرآن و حدیث کے بجائے اسرائیلی اور غیر اسلامی روایات کی پیرو بن گئی۔

''روایات'' سے احادیث مراد نہیں ہیں، بلکہ وہ کہانیاں جن کی کوئی حقیقت یا تاریخی سند نہیں ہے۔ وہ کہانیاں جو سراسر اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف ہیں۔

قرآن مجید صاف لفظوں میں حکم دیتا ہے کہ **ولا تقف ما لیس لك به علم ان السمع و البصر والفواد كل اولئك كان عنه مسئولاً۔** اور جس چیز کا مجھے علم نہو اس کی پیروی مت کو (کیونکہ) بلاشک قیامت کے دن کان، آنکھ اور دل، ان سب سے باز پرس ہوگی (۱۷-۳۶)

لیکن مسلمانوں کا طریق عمل اس آیت کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے عقائد کا دارمدار زیادہ تر انہی روایات پر ہے جن کی کوئی سند نہیں ہے یعنی جن کی صحت کا انہیں علم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے علماء کا حال یہ ہے کہ ان کی تقریریں تو بہت دل پذیر ہوتی ہیں لیکن ان کے سینے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل خالی ہیں۔ اب رہے صوفیا تو ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر عجمی خیالات کی پیروی کرتے ہیں جن کو قرآن حکیم اور حدیث نبوی میں کوئی علاقہ نہیں ہے۔

سالک اور مقامات تصوف کی مشہور اصطلاحیں ہیں۔ سالک کہتے ہیں۔ طالب یا مرید یا جویائے حقیقت کو، جو خدا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ مقامات۔ وہ روحانی مراتب یا منازل ہیں جو اس راہ میں پیش آتی

اسرارِ حیات عیاں ہو سکتے ہیں۔ عشق الٰہی سے انسان ضعیف البیان (ممولا) میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ عناصر کائنات اور زمان مکان (شہباز) کو مسخر کر سکتا ہے۔

دوسرا بند:

اس بند میں اقبالؔ نے حالاتِ حاضرہ اور مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تبصرہ کیا ہے، کہ موجودہ زمانہ میں ہر جگہ انقلاب کارفرما نظر آتا ہے بنی آدم کی طرز حیات میں عظیم الشان تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ،نئی نئی تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں راگ سے عصر حاضر کی جدید سیاسی اور عمرانی تحریکات مراد ہیں مثلاً، اشتمالیت، اشتراکیت، نازیت فسطائیت وغیرہ۔ رازِ فرنگ کے فاش ہونے سے یہ مراد ہے کہ یورپ کے ملوکانہ اور سرمایہ وارنہ نظام کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ چنانچہ اگلے اشعار میں خود اس کی تشریح کرتے ہیں کہ اب دنیا کے باشندے ملوکیت (اسپیریئلزم) سے سخت بیزار ہو چکے ہیں اور سرمایہ داری کا دور ختم ہو چکا ہے،ہی وجہ ہے کہ ایشیائی قومیں اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔

اہل چین جو صدیوں سے ملوک پرستی کی لعنت میں گرفتار تھے، اپنی آزادی کے لئے میدان میں آچکے ہیں۔ اور ہندوستان کے باشندے بھی غلامی کی زنجیریں توڑ رہے ہیں۔ عرب اقوام بھی فلسطین اور عراق، شام اور حجاز میں مغربی استعمار کے خلاف صف آرا ہو چکی ہیں ایشیا کے سیاسی حالات کا مجمل تذکرہ کرنے کے بعد اقبالؔ مسلمانوں کی حالت بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ مسلمان زبان سے توحید کا اقرار کرتے ہیں لیکن بعض غیر اسلامی عقاید ابھی تک ان کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً ابھی تک غیر اللہ کی اطاعت کرر ہے ہیں۔ ان کے تمدن، تصوف، علم، اور شریعت، غرضکہ ان کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں عجمی غیر (اسلامی) افکار کی آمیزش ہو گئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

مسلمانوں کی طرز معاشرت کے بارے میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ ان کی اجتماعی زندگی میں بہت سی غیر اسلامی رسوم داخل ہو گئی ہیں چونکہ ہر مسلمان ان سے واقف ہے اس لئے شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تصوف، بمعنی اصلاح باطن یا تزکیہ نفس، یہ اگرچہ بہت ضروری چیز ہے لیکن اس میں بعض ویدانتی خیالات شامل ہو گئے ہیں اور ان کا نتیجہ بے عملی اور ترکِ دنیا کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے مسلمانوں کے عملی قوتوں کو مفلوج کر دیا۔

اے خدا! میری قوم کے افراد میں عشق و محبت کا وہی رنگ پیدا کر دے جو میرے اندر موجود ہے۔ وہی بے خوابیاں، وہی اختر شماریاں وہی بے تابیاں، وہی آہ وزاریاں وہی طرز نیاز وہی کیفیت سوز وگداز، وہی آرزوئیں وہی جستجوئیں۔ وہی خیالات وہی افکار۔ سب کچھ وہی پید کر دے۔

چوتھا بند: اس بند اور اگلے بند میں اقبال نے زندگی سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں انسان اس کائنات میں اپنی عقل کی مدد سے کسی شئے کی ماہیت معلوم نہیں کر سکتا زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اشیاء کے آثار خواص، اور افعال بیان کر دے چنانچہ اقبال نے چوتھے اور پانچویں بند میں یہی فرض انجام دیا ہے۔

واضح ہو کہ آج تک کوئی سائنسدان یا فلسفی یہ نہیں بتا سکا کہ کائنات میں "حیات" کیسے، کیونکر کس طرح، اور کب نمودار ہوئی؟ عقل انسانی، حیات کی لم تو کیا بتا سکتی ہے، وہ تو اس بات پر حیران ہے کہ اس کرۂ ارضی پر حیات نمودار ہی کیونکر ہو سکی؟ کیونکہ حالات تو اس کے متقاضی تھے کہ حیات نمودار نہ ہوتی، فی الجملہ حیات نمودار ہوگئی اور ارتقا کا نظریہ یہ ہے کہ ابتدا میں یہ بیچاری، شعور اور ادراک دونوں سے عاری تھی ۔رفتہ رفتہ اس کے اندر شعور پیدا ہوا پھر ایک طویل مدت بعد ادراک یا ذہن نمودار ہوا۔ یعنی جب حیات ارتقائی منازل طے کر کے حضرت انسان تک پہونچی تو حیات میں یہ صفت بھی پیدا ہوگئی جب زندگی انسان میں نمودار ہوئی تو اس کی حالت میں انقلاب عظیم آچکا تھا اب وہ عناصرِ فطرت سے قدم قدم پر مفاہمت کرنے والے فریق کے بجائے، اس پر حکومت کرنے کا اعلان کر رہی تھی اور چونکہ انسان میں شعور، ذہین اور ادراک ساری قوتیں پائی جاتی ہیں اس لئے زندگی کائنات کا مرکزی نقطہ قرار پائی یعنی انسان میں آکر زندگی مرتبہ کمال کو پہونچ گئی۔ اس لئے انسان اشرف المخلوقات بن گیا۔

حیوانات اور انسان میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ حیوانات تقدیر کے پابند ہیں لیکن انسان صرف احکام الٰہی کا پابند ہے۔ حیوانات اپنی تقدیر خود نہیں بنا سکتے وہ مجبور محض ہیں لیکن انسان اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی، ہروقت متحرک ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ہر شئے میں ارتقائی عمل جاری ہے اور استقاء حرکت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ نے زندگی اور کائنات دونوں کو ترقی پذیر بنایا ہے۔

جس طرح شعلہ میں دھواں پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح جسم، زندگی کے اندر مخفی ہے اور اسی کی

ہیں۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ان غیر اسلامی عقائد و افکار کی بنا پر مسلمان قوم اسلام کی روح یعنی عشق رسول سے بیگانہ ہوگئی۔

اقبالؔ نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو ''راکھ کے ڈھیر'' سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کیونکہ دنیا میں ترقی اور سربلندی کے کسی نہ کسی نصب العین کا ہونا لازمی ہے آج کل مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں جتنی قومیں ہیں سب کی سب عشق وطن میں سرشار ہیں ہر قوم کا نعرہ یہی ہے''(۱) میرا وطن میری وفاداری کا مرکز ہے (۲) میرا وطن اگر غلطی پر گامزن ہوگا تو بھی میں اسی کا ساتھ دوں گا''(۳)''میں اپنے وطن کے لئے جیوں گا، اور اسی کے لئے مروں گا''۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان، وطن پرستی تو کر نہیں سکتا کیونکہ اس کی بنیادی تعلیم اس کے دین کے خلاف ہے قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے لئے جیتا ہے اور اسی کے لئے مرتا ہے تو وہ وطن کے لئے کس طرح جی سکتا ہے اور کس طرح مر سکتا ہے؟

اب رہی ترقی کی دوسری اور آخری صورت یعنی خدا پرستی، تو اس کے لئے مسلمان تیار نہیں ہے، کیونکہ اس طریقِ حیات میں، بلیک مارکیٹ، ذخیرہ اندوزی، اجارہ داری۔ سرمایہ داری۔ رشوت ستانی، اور اقربا نوازی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اور مسلمان ان ''برکاتِ عالیہ سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔ خلاصہ اس بحث کا یہ نکلا کہ مسلمان وطن پرستی کر نہیں سکتا اور خدا پرستی کرنا نہیں چاہتا۔ تو دنیا میں اس کی سربلندی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس لئے اقبالؔ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ'' مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔''

تیسرا بند:

اس بند میں اقبالؔ نے اللہ سے یہ دعا کی ہے کہ مجھ کو اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت عطا فرما، تاکہ میرے اندر بھی صدیق اکبر اور علی مرتضی کا رنگ پیدا ہو سکے۔ اپنے حق میں دعا کرنے کے بعد انہوں نے ملت کے نوجوانوں کے لئے دعا کی ہے کہ میرے کلام کے ذریعہ سے ان کے اندر بھی عشق رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا جذبہ پیدا کر دے۔ اس کے بعد قوم کے لئے دعا کرتے ہیں کہ میری قوم کی کشتی بھنور میں پھنس گئی ہے۔ اس کو صحیح وسلامت ساحلِ مقصود تک پہونچا دے۔ نیز میری قوم عمل سے بیگانہ ہوگئی ہے اس کے اندر حرکت (عمل) پیدا کر دے۔

حضر، سفر کی ضد ہے اس کے معنیٰ ہیں اپنے گھر یا شہر میں قیام کرنا۔

زندگی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ تصادم ۔ ستیز ، ہنگامہ اور آویزش میں لذت محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کا ارتقاء انہی باتوں پر موقوف ہے۔ اگر وہ اپنے ماحول سے جنگ نہ کرتی اگر وہ غیر مناسب حالات سے متصادم نہ ہوتی، اگر وہ مشکلات کا مقابلہ نہ کرتی، تو ابھی تک حشرات الارض ہی کی شکل میں ہوتی۔ حضرت انسان میں اس کا جلوہ نظر نہ آتا۔

کائنات میں زندگی کی سب سے بڑی دشمن یا مخالف موت یا فنا تھی لیکن وہ اپنی مخفی طاقتوں کی بدولت، اس پر غالب آ گئی۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب زندگی پہلی مرتبہ ظاہر ہوئی تو پروٹوپلزم کی شکل میں ظاہر ہوئی اس ابتدائی یا اولین جوہر حیات میں نہ حواس خمسہ نہ شعور ہے۔ نہ ادراک ہے۔ نہ نظام عصبی ہیں نہ استخواں ہیں نہ دوسرے اعضاء ہیں۔ اگر زندگی کے اندر طاقت مخفی نہ ہوتی تو وہ اپنے مخالفوں پر غالب نہیں آسکتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ماحول پر غالب آئی اور چونکہ اس کے اندر مذاق دوئی یعنی نر اور مادہ کا امتیاز بھی موجود تھا۔ اس لئے بذریعہ توالد و تناسل زوج سے فوج بن گئی۔

جو لوگ علم الحیات سے ناواقف ہیں وہ اسے بے ثبات تصور کرتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بر عکس ہے اگر زندگی کی ادنیٰ صورت مٹ جاتی ہے تو اسی سے اعلیٰ صورت نمودار ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ زمانہ اسی زندگی کی حرکت کا دوسرا نام ہے۔

چھٹا بند:

اس بند میں اقبالؔ نے خودی کی حقیقت بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ انسانی خودی زندگی کی سب سے اعلیٰ صورت یا انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس بات کو انہوں نے بڑی عمدہ مثال سے سمجھایا ہے یعنی اگر زندگی کو تلوار فرض کیا جائے، تو خودی اس کی دھار ہے۔ اور جس طرح دھار کے بغیر تلوار بیکار ہے اسی طرح خودی نہ ہو تو زندگی بے معنی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ خودی زندگی کی مخفی قوتوں کا نام ہے اگر کائنات کو انسان فرض کیا جائے تو خودی کو اس کے شعور سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ انسان میں اگر شعور نہ ہو تو اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔ اسی طرح اگر کائنات میں خودی کا وجود نہ ہو تو ساری کائنات بے مقصد ہو کر رہ جائیگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب خودی کے لئے ہے۔ یعنی خودی اشرف المخلوقات ہے۔

بدولت اسے خارجی وجود حاصل ہوتا ہے۔ زندگی کی ماہیت چونکہ عناصر میں گرفتار بھی ہے، اوران سے بیزار بھی ہے اقبالؔ نے زندگی کو ثابت اور سیار دونوں قرار دیا ہے۔ حیات اپنے مظاہر کی بوقلمونی کے باوجود ایک ''وحدت'' ہے جس طرح دریا اپنی واضاع واشکال مختلفہ کے باوجود از اول تا آخر ایک ہی دریا ہے جس میں دوئی یا کثرت نہیں ہے۔ لیکن یہ وحدتِ حیات کثرت مظاہر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ کائنات حیات ہی کی بدولت وجود میں آئی ہے۔

اقبالؔ نے عالم کو ''سومنات'' یعنی بت سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ انسان کی نگاہ عموماً مظاہر کائنات ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ زندگی کی خاصیت یہ ہے وہ تکرار کو پسند کرتی یعنی کوئی فرد، دوسرے فرد سے مماثل نہیں ہے ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے جدا اور مغائر الوجود یقین کرتا ہے۔ زندگی مختلف افراد میں جلوہ گر ہے اس لئے اس میں انجمن کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے لیکن اس کے باوجود، مادی نگاہ سے مخفی ہے یعنی خلوت نشیں ہے۔

کائنات میں جس قدر اشیاء نظر آتی ہیں مثلاً اجرام فلکی، معدنیات، بیاباں، گلستاں وچرندے اور پرندے سب اسی زندگی کے مختلف مظاہر ہیں اور اسی کے کرشمے ہیں۔

پانچواں بند:

اس بند میں بھی زندگی ہی کی صفات واضح کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کائنات میں کوئی شئے ساکن یا جامد نہیں ہے۔ ہر شئے میں حرکت ہے۔ خواہ محسوس ہو یا نہ ہو۔

وجود ہر آن نئی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے اور ہر لحظہ نئی صورتوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ جو لوگ حقیقت سے آشنا نہیں ہیں وہ زندگی کو ایک راز سمجھتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے راز ہی ہے۔ لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ زندگی ذوقِ پرواز کا دوسرا نام ہے یعنی زندگی کی غایت یہ ہے کہ وہ ہر وقت ارتقائی منازل طے کرتی رہے۔

اقبالؔ نے زندگی کی اسی حقیقت کو اپنے کلام میں مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ زندگی نے بہت سی پستیاں اور بلندیاں دیکھی ہیں۔ یعنی زندگی بہت سی ادنی منزلوں سے ترقی کر کے موجودہ درجہ تک پہنچتی ہے اور اس کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ ہر وقت سفر میں رہتی ہے اور اگر ہم یہ کسی موقع پر کہہ دیتے ہیں کہ زندگی ساکن یا قائم ہے تو یہ الفاظ حقیقت کے بجائے مجاز پر دلالت کرتے ہیں۔

علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے: اکل حلال اور صدق مقال کی اہمیت اور ضرورت کو بڑی شد و مد کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ صدق مقال اور اکلِ حلال، یہ وہ خوبیاں ہیں جن میں دین اسلام کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ یعنی جب تک ایک انسان ان دونوں باتوں پر عامل نہ ہو، وہ مسلمان نہیں بن سکتا ہے۔

خودی کے استحکام کی دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمان کو لازم ہے کہ صرف اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے تاکہ دوسروں کے سامنے سجدہ کرنے سے نجات مل جائے۔

ان دو شرطوں کی وضاحت کے بعد اب اقبالؔ یہ بتاتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہونچا دے تو ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

کہتے ہیں کہ اے مخاطب! یہ کائنات تیری خودی کی پہلی منزل ہے، اسے اپنی مستقل قامت گاہ مت سمجھ یہ دنیا تیری خادم ہے، اسے مقصود مت قرار دے تیری اصل مادی نہیں ہے تو اس دنیا سے نہیں ہے، ہاں یہ دنیا ضرور تجھ سے ہے۔ یعنی تیرے لئے پیدا کی گئی ہے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ کائنات (زن، زر یا زمین) انسان کا مقصد حیات نہیں ہے۔ تو لامحالہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر اس کا مقصد کیا ہے؟

اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کے طلسم کو باطل کر کے کائنات اپنے قابو میں کر لے۔ لیکن جو شخص اپنے پیٹ کو اپنا مقصد حیات سمجھتا ہے۔ وہ اس طلسم کو کیسے باطل کر سکتا ہے۔

اس کائنات میں گردش روزگار اور اس نظام شمسی کا مقصد یہ ہے کہ تیری خودی کی مخفی قوتیں بروئے کار آسکیں، اور تو اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہو کر، اپنا مقام حاصل کر سکے۔ تو خلیفۃ اللہ علی الارض ہے۔ تو نائب خدا ہے۔ تو عناصر کائنات پر حکمراں ہے، تو فاتحِ عالم خوب و زشت ہے۔ تو اشرف الخلوقات ہے۔

اے مخاطب! میں لفظوں کے ذریعہ سے تجھ پر تیری حقیقت واضح نہیں کر سکتا کیونکہ تیری حقیقت الفاظ کی محتمل نہیں ہو سکتی اور یہ بات بھی ہے کہ تیری حقیقت غیر مادی ہے، اور میرے الفاظ بہر حال مادی ہیں پس وہ تیری حقیقت کی صراحت نہیں کر سکتے۔

اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو عشق رسولؐ میں فنا ہو کر

خودی، زمانہ کے ساتھ ہم آغوش ہے۔ زمانہ کا تصور خودی کے بغیر نہیں ہوسکتا خودی نہ ہوتی تو زمانہ کا تحقیق کون کرتا؟ اور خودی کا تصور زمانہ سے علیحدہ نہیں ہوسکتا دونوں لازم وملزوم۔ خودی، اگرچہ مکان وزبان کی قید میں رہ کر ترقی کرتی ہے اور جب نقطۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے تو زمان ومکان پر حکمران ہوجاتی ہے کیونکہ خالق خودی نے اس کے اندر یہ صلاحیت ودیعت کردی ہے۔

جب خودی مرتبہ کمال کو پہونچ جاتی ہے اور اس کے لئے اسے بڑے مجاہدے کرنے پڑتے ہیں تو پھر اس میں یہ قوت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی ضرب سے پتھر کو ریگِ رواں بنا سکتی ہے اس کی استقامت اور استحکام کا راز، اس کے مسلسل سفر کی حالت میں مضمر ہے اگر وہ ساکن ہوجائے تو فنا ہوجائے گی۔

کہیں چاند کی کرن کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کہیں شرارِ سنگ کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور بذات خود صورت سے پاک اور معرا ہے۔ اس لئے کہ غیر مادی ہے۔

ساتواں بند:

اس بند میں اقبال نے پہلے چار شعروں میں خودی کی نگہبانی کی تلقین کی ہے اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ جب خودی عشق رسول ؐ کی بدولت مرتبۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے تو اس میں عقل کو حیران کردینے والی صفات پیدا ہوجاتی ہیں اور وہ زمان ومکان پر حکمراں ہوجاتی ہے۔

چونکہ اللہ کی صفات میں سے ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ زماں ومکان کی قید سے بالاتر ہے بلکہ ان پر حکمراں ہے۔ یہی وجہ کہ اقبال نے بار بار مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہے کہ اگر تم خلافت الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہونا چاہتے ہو تو پہلے اپنے اندر خلافت کی اہلیت پیدا کرو یعنی کسی مرشد کامل کی صحبت میں رہ کر اپنی خودی کو زمان ومکان کی قیود سے بالاتر کرلو اس کے بغیر خلافتِ الٰہیہ کا حصول عقلاً اور شرعاً دونوں طرح محال ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جو شخص اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہونچانا چاہتا ہے اس کے لئے پہلی شرط اکل حلال، یعنی ناجائز کمائی کا ایک لقمہ بھی اگر حلق کے نیچے اتر گیا تو خودی پر موت طاری ہوجائے گی۔ اور جب ایک چیز مردہ ہوگئی تو اس کی ترقی کا سوال ہی خارج از بحث ہوجاتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح زہر کھانے سے آدمی مرجاتا ہے اسی طرح لقمۂ حرام کھانے سے خودی کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے فلسفہ میں، اور اقبال کا فلسفۂ اسلام سے

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض اس عہد کے نہایت ممتاز اور ہر دلعزیز شاعر تھے۔ ان کی پیدائش 13/ فروی 1911 کو سیالکوٹ کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم چرچ مشن اسکول سیالکوٹ میں حاصل کی۔ ان کے والد چودھری سلطان محمد خاں نے اپنی سعی و کاوش سے عربی، فارسی اور انگریزی میں دستگاہ حاصل کی اور والی افغانستان کے شہزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ کچھ مدت تک انگلستان میں افغاستان کے سفیر بھی رہے۔ بعد میں سازشوں کی زد میں آگئے اور باقی زندگی بیرسٹر کی حیثیت سے سیالکوٹ میں بسر کی۔

فیض احمد فیض نے اعلیٰ تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ یہاں سے انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد انھوں نے اپنی ملازمت کا آغاز 1935 میں انگریزی لکچرر کی حیثیت سے امرتسر کے ایک کالج سے کیا۔ بعد لاہور چلے گئے، جہاں وہ پڑھاتے بھی رہے اور ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کردیا۔ تقسیم سے چھ مہینے پہلے فیض کو ''پاکستان ٹائمز'' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا لیکن تین برس کے اندر اندر پاکستانی فوج کے چند افسروں کے ہمراہ انھیں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کرلیا گیا اور چار برس تک وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ اس دوران ایسے لمحات بھی آئے کہ انھیں پھانسی پر بھی لٹکایا جاسکتا تھا۔ چار سال کے بعد انھیں رہا کردیا گیا۔

فیض کا پہلا مجموعہ ''نقش فریادی'' 1945 میں شائع ہو چکا تھا لیکن ان کی شاعری میں انقلابی آہنگ قید کے زمانے میں پیدا ہوا اور ''دستِ صبا'' 1952 کی اشاعت سے ان کی شہرت بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ ان کے کل سات مجموعے ہیں، ''زنداں نامہ'' 1956، دستِ تہِ سنگ'' 1964، ''سرِ وادی سینا'' 1971، ''شامِ شہرِ یاراں'' 1974، اور ''مرے دل مرے مسافر'' 1982 میں ان کا کلیات '' حرف حرف'' کے نام سے ہندوستان میں شائع ہوا تھا، بعد میں ''سارے سخن ہمارے'' کے نام سے لندن سے 1982 میں اور ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے لاہور سے 1984 میں شائع ہوا۔ فیض کا انتقال 20 نومبر 1984 کو لاہور میں ہوا۔

فیض کو سوویت یونین کا سب سے بڑا اعزاز لینن امن انعام بھی دیا گیا۔ فیض احمد فیض کا یہ کمال

(اسی کو اپنے من میں ڈوبنا کہتے ہیں) لیکن ''ذات'' کو بے پردہ دیکھنے کے لئے پہلے اپنے کو دیکھنا لازمی ہے اور جب انسان اپنے آپ کو دیکھے گا تو اس وقت اسے یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ میں تو اسی کو دیکھ رہا ہوں عاشق جب تک اپنی خودی سے آگاہ نہیں ہوتا، اس وقت تلاش محبوب میں سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جسے میں صحرا اور بیابان میں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تو میرے اندر ہی پوشیدہ تھا اس وقت سالک بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ

بفضلِ مرشد کھلا یہ عقدہ کہ یار مجھ میں، میں یار میں ہوں۔

یہی مطلب ہے اس مقولہ کا کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ۔ میری رائے میں اس سے بلند تر کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ اور یہی وہ صداقت ہے جس سے بالاتر کوئی صداقت نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے

بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن
سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدۂ دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

خلاصہ

تمہید: فیض احمد فیض اردو کے انقلابی شاعر تھے۔ اور کمیونسٹ خیالات کے حامی تھے۔ آپ کی نظمیں اور غزلیں روسی انقلاب کی آئینہ دار ہیں مگر آپ نے رومانی انداز میں اپنے انقلابی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ زیرِ نظر نظم صبح آزادی بھی اسی طرح کی ایک نظم ہے جس میں وہ اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان کو آزادی مل چکی ہے۔ ان کی نظر میں ہندوستان کے عوام کو ابھی پوری آزادی نہیں ملی۔ اس لئے جنگ آزادی کو جاری رکھنے کا پیغام دیتے ہیں۔

ہے کہ انھوں نے غزل کی کلاسیکی روایات سے پوری طرح استفادہ کیا، اور اسے انقلابی فکر سے ہم آہنگ کر کے ایک بالکل نئی کیفیت پیدا کی۔ ان کا ذوقِ شعر بڑا رچا ہوا اور بالیدہ تھا۔ انھوں نے انقلابیت کی خاطر تغزل کو اور تغزل کی خاطر انقلابیت کو کبھی قربان نہیں کیا، بلکہ اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت سے انقلابی فکر اور عاشقانہ لہجے کو ایسا آمیز کیا کہ اردو شاعری میں ایک نئی جمالیاتی شان پیدا ہوگئی اور ایک نئے طرز بیان کی بنیاد پڑی جو انھیں سے منسوب ہوگیا۔

فیض اردو شاعری کو ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی دین تھے۔ وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ ان کا لہجہ غنائی اور فکر انقلابی تھی، انھوں نے زندگی میں بڑی سے بڑی سختیاں جھیلیں لیکن ظلم و ستم اور بے انصافی کے ساتھ کبھی سمجھوتا نہیں کیا اور شاعر کے منصب کو بھی ہمیشہ نبھایا۔ ان کی شاعری میں ایسی دردمندی، دلاویزی، تاثیر اور جمالیاتی رچاؤ ہے کہ اس کا دل پر فوراً اثر ہوتا ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں اصناف میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

صبح آزادی

فیض احمد فیض

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب مست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غم دل

جواں لہو کی پراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے

نثار میں تری گلیوں

فیض احمد فیض

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جان بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد

کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کہ دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں

ہندوستان میں آزادی کا سورج نکل چکا ہے۔ روشنی پھیل رہی ہے مگر یہ روشنی اندھیرے میں ملوث ہے۔ یہ وہ صبح آزادی نہیں ہے جس کا ہمیں برسوں سے انتظار تھا۔ جس صبح کی تلاش میں ہم روشنی کے دیوانے یہ سوچ کر نکلے تھے کہ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی روشنی نصیب ہوگی۔ سفینہء غم دل کو کہیں نہ کہیں ساحل مل تو سکے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔

ہم جب آزادی کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ نچھاور کر کے آگے بڑھنے لگے تو پتہ نہیں کتنی ہی دشواریاں راستے میں آئیں۔ عیش و عشرت ہمیں اپنی طرف پکارتی رہی۔ پیار و محبت، دولت و حسن کے کتنے ڈورے ہم پر ڈالے گئے مگر ہماری نظریں صرف آزادی کی منزل پر جمی ہوی تھیں ہم طرآ ہستہ آہستہ ہر طرف سے منہ موڑ کر منزل کی طرف گامزن تھے۔

اب ہم نے سنا ہے کہ اندھیرا ڈھل چکا ہے روشنی آرہی ہے منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ اب اہل دستور (سیاست دانوں) کا رویہ بدل چکا ہے۔ ہر طرف عیش ونشاط ہے خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ مگر یہ سب ایک سراب سا دکھائی دیتا ہے کیونکہ آزادی وطن کا اثر کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ خوشی کہاں سے آئی اور کیسے یک بیک غائب ہوگئی پتہ ہی نہیں چلا، کیونکہ ہم آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہیں۔ غلامی کی سطح بدل گئی ہے۔ ذہن، دماغ اور جذبات ابھی غلامی کی زنجیروں میں قید ہیں۔ اسی لئے ہمیں آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنا ہے۔ ابھی آزادی کی صبح پوری طرح نمودار نہیں ہوئی۔ منزل تک پہنچنے میں ابھی دیر ہے۔

شاعر نے اس پوری نظم میں سیاسی اصطلاحات کا کہیں بھی استعمال نہیں ہے۔ بلکہ ایک سیاسی پیغام کو عشقیہ انداز میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے یہی شاعر کا کمال ہے۔

درندے سڑکوں پر کھلے عام پھر رہے ہیں۔ حکومت وشہرت اور کرسی کے لالچی منصف بنے ہیں۔ ایسے میں ہم کس سے جاکر فریاد کریں کس سے انصاف چاہیں۔

مگر ہم مایوس نہیں ہیں۔ ہم تیری جدائی میں دن گذار تو رہے ہیں۔ قید خانے کے دروازے بند ہوتے ہیں تو ہم یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ آزادی مل چکی ہے۔ اب کس مجاہد آزادی کو قید و بند کی سزا نہیں ہوگی۔ بہرحال یہ ہماری تصور ہی ہے ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ نہ ہمارے اپنی جیت نئ ہے اور انھیں بھی اپنی ہار پر کوئی غم نہیں۔ ہم آج بھی ایک خوش آئند صبح کی آرزو میں جی رہیں ہیں۔ ہمیں کس کا گلہ ہے نہ شکوہ ہم پر امید ہیں کہ یہ ظالم وتشدد صرف چند دنوں کی بات ہے۔ ہمیں اس سے بہت جلد نجات ملے گی۔ تیری محبت اور تیری چاہت میں ہم اپنے دن گذار رہے ہیں کہ کبھی تو دن پلٹیں گے اور تجھے آزادی نصیب ہوگی اور ہم آزاد ہندوستان میں سانس لیں گے۔

☆☆☆☆☆☆

گرفتِ سایہءِ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
مگر آج، اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردش لیل و نہار رکھتے ہیں

خلاصہ

تمہید: فیض احمد فیض کی یہ نظم بھی سیاسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ کم از کم نظم میں فیض نے 'وطن' لفظ کا استعمال تو کیا ہے۔ لہجہ میں طنز پایا جاتا ہے۔ استعارات کا بھرپور استعمال کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اے وطن ہندوستان میں تجھ پہ صدقے جاؤں۔ سنا ہے کہ آج کل تیرے یہاں نئے دستور نئے قوانین نافذ کئے جا چکے ہیں۔ یہاں کسی کو سر اٹھا کر چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ نظریں جھکا کر با ادب چلنا فرض ہے۔ دل والوں کے لئے تو یہ قوانین کیوں کھو کھلے ہیں۔ نیک انسان چھپے بیٹھے ہیں اور

گاتا جائے بنجارہ' کے دیباچہ میں ساحر نے اس بات پر زور دیا کہ ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ فلمی گیتوں کو تخلیقی شاعری سے قریب لایا جائے تاکہ جدید سیاسی خیالات، جو انسان کی فلاح سے ہم آہنگ ہیں، عوام تک ان گیتوں کے ذریعے سے پہنچیں۔

ساحر کے کلام کے مجموعے حسب ذیل ہیں:

تلخیاں (1944)، 'پرچھائیاں' (1955)، 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' (1973)۔ اپنے لاہور کے ساتھی دیوندر ستیارتھی پر بھی انھوں نے ایک کتاب 1948 میں لکھی تھی۔ ساحر کو 1973 میں پدم شری کے خطاب سے نوازا گیا۔ اسی سال انھیں سوویت لینڈ نہرو انعام اور مہاراشٹر اردو اکادمی ایوارڈ بھی ملے۔ 1980 کو ساحر کا ممبئی میں انتقال ہوا۔

تاج محل

ساحر لدھیانوی

تاج، تیرے لیے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادئ رنگیں سے عقیدت ہی سہی

میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟

میری محبوب! پس پردۂ تشہیر وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی

ساحرلدھیانوی

ساحر 1922 میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے ان کا اصل نام عبدالحی تھا۔ کالج کے طالب علمی کے زمانے میں ہی تو شعر بھی کہنے لگے، اور لاہور کی ادبی فضا نے ان کے ذوق کو جلا بخشی۔ ساحر کے والد ایک گوجر گھرانے سے تھے۔ دولت کی افراط سے ان کی زندگی میں عیش ونشاط کا ایک سیلاب تھا۔ جس پر شاید ان کا بھی قابو نہیں تھا۔ ساحر کی والدہ اور والد کے تعلقات ناخوشگوار ہوئے، پھر کشیدہ ہوئے اور پھر ٹوٹ گئے اور نوبت طلاق تک پہنچی۔ ساحر نے یہ سب کچھ دیکھا اور یہ ان کی نفسیات کا ایک حصہ بن گیا۔ سماج کی گھٹن اور عورت کی مجبوری اور بے بسی کے جو مرقعے ساحر کے یہاں ہیں ایسی جذباتی شدت کے ساتھ ان کے کسی ہمعصر کے یہاں نہیں ملتے۔

ہائی اسکول کرنے کے بعد ساحر نے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا۔ اس وقت آل انڈیا اسوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم ممبر تھے۔ اور یہ فیڈریشن کمیونسٹ پارٹی سے منسلک تھی، اس لیے ان کی سرگرمیاں خطرناک سمجھی گئیں اور انھیں کالج سے نکال دیا گیا۔ پڑھائی جاری رکھنے کے لئے وہ لاہور گئے اور دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں بھی وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں میں شریک رہے اور اسی کی پاداش میں دیال سنگھ کالج سے بھی نکالے گئے۔ بائیں بازو کی سیاست اور ترقی پسند ادبی تصورات سے ان کی وابستگی کے باعث نظریاتی طور پر ان میں پختگی آئی اور یہ رنگ انکی شاعری میں نمایاں ہوا، اور اسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

ساحر کئی رسائل کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان میں ادب لطیف (لاہور)، سویرا (لاہور) اور شاہراہ (دہلی) شامل ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد وہ دہلی آ گئے۔ تلاش معاش میں ممبئی گئے۔ وہاں انھوں نے فلموں میں نئی طرح کے گیت لکھے، غزلیں لکھیں، نظمیں لکھیں اور فلمی سنگیت کو ایک نیا روپ اور اسلوب دیا۔ فلمی دنیا میں ساحر نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور دولت، شہرت، مقبولیت ہر چیز نے ان کے قدم چومے۔ فلمی گانوں کو شعر کی چاشنی ساحر کی دین ہے اور جو ادبی چھاپ انھوں نے فلموں پر چھوڑی، اس نے ایک نیا انداز دیا۔

تنہائیاں ساحر کی نظموں کا وہ مجموعہ ہے جو نوجوانوں میں بہت مقبول رہا۔ کیونکہ نوجوانوں کو اس میں اپنے دلوں کی دھڑکنیں ملیں۔ ایک بہتر اور خوشحال زندگی کے خواب ملے۔ اپنے فلمی گیتوں کے مجموعے

خلاصہ

تمہید: دنیا کے عجائبات میں تاج محل کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ مغل شہنشاہوں نے ہندوستان میں کئی شاندار اور بے مثال محل، قلعہ اور مقابر تعمیر کروائے مگر ان تمام میں تاج محل اپنی مثال آپ ہے۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے اپنی بیگم ممتاز محل کی یاد میں جمنا کے کنارے اس کے مقبر پر یہ عالی شان عمارت تعمیر کروایا تھا۔ جو بیس برسوں میں بائیس ہزار مزدوروں کی محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے۔ لوگ اسے عظیم شہنشاہ کی محبت کی نشانی مانتے ہیں جو تا قیامت ساری دنیا کو اپنی پوری تابنا کی کے ساتھ محبت کا پیغام دیتی رہے گی مگر کئی لوگ خاص کر اشترا کیت کے ماننے والے اسے محبت کی نشانی ماننے کی بجائے ایک ڈکیٹٹر کی اپنی طاقت اور قوت کے اظہار کی علامت ہی تصور کرتے ہیں۔ چونکہ ساحرلدھیانوی کا تعلق بھی اشترا کی تحریک کے ساتھ رہا اسی لئے انھوں نے بھی اس عمارت کو محبت کی علامت کی بجائے سرمایہ دارانہ کی نظام کی علامت قرار دیا ہے۔

عام طور پر جوان محبت کرنے والے تاج محل میں ملنے اور اپنی محبت کے اظہار کرنے کے لئے اچھی جگہ تصور کرتے ہیں۔ چونکہ یہ محبت کی نشانی ہے اسی لئے اس خوبصورت عمارت میں ملاقات کو اچھا شگون اور نفسیاتی اور جذباتی سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی مانتے ہیں۔ مگر ساحرلدھیانوی اس کے حق میں نہیں ہے۔ ساؔحر کی محبوبہ بھی ساؔحر سے تاج محل میں ملنے کے ارادے کا اظہار کرتی ہے تو شاعر کہتا ہے کہ:

اے میری محبوب! یہ ہوسکتا ہے کہ تاج سے تجھ کو گہری عقیدت ہو اور تم اسے محبت اور پیار کی خوبصورت نشانی مانتی ہو مگر اے میری محبوب! میں اس رنگین وادی میں تجھ سے مل نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ ایک شہنشاہ کی محفل ہے جہاں غریبوں کا گزر ہو نہیں سکتا۔ اس مقبرہ کی تعمیر میں بادشاہ کے غرور اور تکبر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جہاں سچی پیار بھری روحیں سفر نہیں کر سکتیں۔

اے میری محبوب! تو تو نادان ہے۔ تجھے پتہ ہی نہیں۔ کاش تو دیکھ سکتی۔ ایک شہنشاہ نے اپنی محبوبہ کی خاطر یہ محل بنوایا ہے۔ اس کی تعمیر کا مقصد اپنے پیار کا اظہار نہیں بلکہ اپنے تکبر اور سامراجیت کا اظہار ہے اس کا پیار، محبت اور وفا جھوٹی ہے سب دکھاوا ہے۔ اے محبوب تجھے پتہ ہے کہ یہ شہنشاہوں کے مقبرے ہیں جو اپنی چمک دمک دکھلا رہے ہیں کاش تم اپنے تاریک مکانوں کو دیکھ سکتی جہاں چراغ

اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
دامن دہر پہ اس رنگ کی گل کاری ہیں
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے!

مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین کا شمار صفِ اول کے ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ آزاد نظم کے فروغ اور مقبولیت میں ان کا خاص ہاتھ رہا ہے۔ وہ 3/ فروری 1908 کو آندھرا پردیش کے شہر میدک میں پیدا ہوئے - 1937 میں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ 1939 میں گاندھی جی کے ستیہ گرہ پر اپنی نظم ''مسافر'' لکھی اور اسی سال سٹی کالج میں اردو کے استاد مقرر ہوئے، لیکن 1941 میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے، 1944 میں کلام کا پہلا مجموعہ ''سرخ سویرا'' شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''گلِ تر'' کے نام سے شائع ہوا۔ مخدوم کا کلیات ''بساطِ رقص'' کے نام سے 1966 میں حیدر آباد سے شائع ہوا۔ کئی بار جیل گئے۔ 1956 میں آندھرا لیجیسلیٹو کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ 25/ اگست 1969 کو دہلی میں تھے کہ دماغ کی شریانیں پھٹ جانے سے انتقال ہوا۔ ''بساط رقص'' پر پس از مرگ ساہتیہ اکادمی سے انھیں نوازا گیا۔

مخدوم محی الدین بنیادی طور پر سیاسی آدمی تھے۔ ان کی سیاسی نظمیں جلسوں اور جلوسوں میں گائی جاتی تھیں۔ اس عہد کے بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی انقلاب اور رومان کا خو بصورت سنگم پیش کرتی ہے۔ مخدوم نے کم لکھا، لیکن جتنا بھی لکھا اچھا لکھا۔ ان کے پہلو میں ایک سچے شاعر کا دل دھڑکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض نظمیں شاعری کے اعلیٰ ترین تقاضوں کو پورا کرتی ہیں اور رمزیت وایمائیت، دردمندی اور لطف وتاثیر کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ ان نظموں میں تغزل، والہانہ پن اور وارفتگی کی ایسی کیفیت ہے کہ دل پر اثر ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

جلانے کے لئے تیل بھی میسر نہیں ہے۔

دنیا میں لوگوں کروڑوں بلکہ ان گنت لوگ محبت کے جذبے سے سرشار ہیں۔ ان کی محبت بھی سچی تھی، جذبات بھی سچے تھے۔ کئی لوگوں نے تو محبت میں اپنی جان تک کی قربانی دے دی۔ مگر آج لوگ انھیں بھلا چکے انھوں نے اپنی محبت کی نشانی عمارتوں کی شکل میں نہیں چھوڑی ان کے وہ تو غریب، نادار اور مفلس رہے۔ ان کے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ بڑے بڑے محل تعمیر کرتے۔

شہنشاہوں نے اپنی زندگی میں اپنے لئے عظیم اور شاندار محل تعمیر کروائے، قلعہ بنوائے اور مرنے پر ان کے مزاروں پر خوب صورت مقابر بھی بنوائے گئے۔ اس کے لئے مال و دولت انھوں نے اپنے ہی غریب اور مفلس عوام سے زبردستی حاصل کی۔ اپنی شہرت، اپنی عظمت، اپنی عیش وعشرت کے لئے انھوں نے عوام کا خون چوسا ہے۔ یعنی ان عمارتوں میں ہمارے اجداد کا خون بھی شامل ہے۔

اے میری محبوب! آج جس تاج محل کی خوب صورتی پر دنیا فدا ہے۔ اس کے معمار و سنگتراش کے ہاتھوں کو کس نے دیکھا ہے ان ماہر ہنرمندوں کی کس نے تعریف کی ہے۔ اس محل کی تراش خراش میں ان مزدوروں کی صرف محنت شاقہ ہی نہیں بلکہ ان کے جذبات اور احساسات بھی شامل ہیں۔ کیونکہ ان مزدوروں کو بھی کسی نہ کسی سے عشق رہا ہوگا۔ انھوں نے بھی کسی سے محبت کی ہوگی مگر وہ مجبور تھے، نادار تھے، مفلس تھے اس لئے ان کی محبوباؤں کی خاطر وہ کوئی محل نہیں بنا سکے کوئی نشانی نہیں چھوڑ سکے۔ لیکن ان کی محبت کا وہ جذبہ تاج کی تعمیر میں پنہاں ہے ایک مطلق العنان بادشاہ نے ان کے اس پیار کے جذبات کو مال وزر کے زور پر خرید لیا ہے۔

اے میری محبوب! تم جانتی ہو کہ جمنا کے کنارے پوری شان وشوکت کے ساتھ کھڑے اس خوبصورت محل کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما ہے۔ تم جانتی ہو کہ اس کے رنگین اور منقش در و دیوار کیا کہہ رہے ہیں۔ اس پر کتنا سرمایہ صرف کیا گیا۔ دراصل زرِ کثیر صرف کر کے اس عمارت کو بنا کر ایک شہنشاہ نے اپنی جاہ وحشمت کا اظہار کیا ہے اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت نہیں۔ اس شہنشاہ نے غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے کہ غریب اس طرح کا مقبرہ بنا نہیں سکتے۔ اس لئے اے میری محبوب! ہم کسی اور جگہ مل سکتے ہیں اس مقبرہ میں ہم مل نہیں سکتے۔

مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدے کے دراڑوں نے دیکھا انھیں
یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں
نسخہء کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج مداوائے الفت بھی ہے

خلاصہ

تمہید: مخدوم محی الدین نے یہ نظم دراصل اپنے دوست اور اس کی محبوبہ کی یاد میں لکھی تھی۔ مخدوم محی الدین کے ایک دوست تھے جنھیں ایک لڑکی سے عشق ہو چلا تھا۔ لیکن زمانے نے ان کی محبت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چونکہ مخدوم محی الدین اکثر و بیشتر قید و بند میں رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قید خانہ سے چھوٹے تو سیدھے اپنے دوست سے ملنے گئے وہ وہاں نہیں تھے، ایک آدمی نھیں ایک قبرستان لے گیا جہاں ان کے دوست اور ان کی محبوبہ دفن تھیں۔ انھوں نے شاید زمانے کی صعوبتوں سے تنگ آکر خودشی کر لی تھی۔ انکی قبروں پر ایک چمیلی کا منڈوا چڑھا ہوا تھا مخدوم آبدیدہ ہو گے اور یہ نظم لکھی۔

دو جوان محبت کرنے والوں کے بدن پیار کی آگ میں جل کر قبرستان کے ایک حصے میں دفن ہیں۔ یہ جگہ اک مئے کدے سے دور ہے جہان وہ پیار کی شراب سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اب ان کی قبروں پر چمیلی کے پھول کی بیل چڑھی ہوئی ہے۔ جب تک زندہ رہے نفرت کے کانٹوں سے مقابلہ کرتے تھے جب مر گئے ہیں تو پھولوں کی چادران پر تنی ہوئی ہے۔

ایک دوسرے سے وفاداری ہیں ان کا پیار ہے۔ یہی ان کا خدا ہے اور اسی پیار کی چتا میں انھوں نے خود کو چھونک دیا۔ ان کے مقابر کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ دو تازہ پھول رات کے وقت اوس میں بھیگ کر چاندنی میں نہا رہے ہیں۔ مگر چمن کی آہستہ آہستہ چلنے والی ٹھنڈی ہوا جیسے ماتم کر رہی ہوا ان کی موت پر۔

ہم نے ان دو معصوم پیار کرنے والوں کو دن رات، اندھیرے اجالے ہر جگہ ایک ساتھ دیکھا ہے باہوں میں باہیں ڈالے دنیا کی فکروں سے دور۔ مسجدوں کے مناروں، مندروں کے کواڑ اور میکدے

چارہ گر

مخدوم محی الدین

اک چمبیلی کے منڈوے تلے
مئے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

پیار حرف وفا
پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا

اوس میں بھیگتے چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو
تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرف ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ کر
گرم رخسار پر
ایک پل کے لیے رک گئی

ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں

اک کمیں گاہ سے

پھینک کر اپنی نوکِ زباں

خون نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے

صبح کا کچھ اجالا، اُجالا بھی ہے

ہمدمو!

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی

کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

خلاصہ

تمہید: مخدوم محی الدین اکیسویں صدی کے ایک اہم سیاسی شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ اپنے سیاسی نظریات، اور سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے کی وجہ سے انھیں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ آندھرا پردیش کے تلنگانہ کے مسئلہ میں وہ خود بھی شامل تھے اس لئے سیاسی انتہا پسند انھیں انقلابی لیڈر اور شہید بھی مانتے ہیں۔ ان کی انقلابی شخصیت ان کے نظموں میں بھی جھلکتی ہے۔ مگر جہاں اکثر انھوں نے آزادی وطن کی بات کی ہے وہاں قارئین کے جذبات کو جھنجھور کر رکھ دیا ہے۔

یہ نظم چاند تاروں کا بن صبح آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی ہے شاعر کا کہنا ہے کہ ہم مجاہدانِ آزادی وطن نے وطن کی آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ مٹا دیا یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی وطن پر نثار کر دیا۔ ہمارے بدن موم کی طرح پگھل گئے۔ غلامی کی سیاہ تاریکی میں آزادی کی شمع ہولے ہولے جھلملانے لگی تھی۔ اور دیش میں ایک نئی صبح نمودار ہونے سے قبل کی تاریکی میں امید و بیم کی کرنیں بھی چمک رہی

دراڑ اس کی گواہ ہیں۔ لیکن افسوس وہ اب نہیں رہے۔ اے چارہ گر صرف اتنا تو بتا دے کہ تیری رزنبیل میں جہاں دنیا کے ہر مرض کو دور کرنے کا نسخہ موجود ہے، جہاں تو نے ہر مسئلہ کا حل باندھ رکھا ہے۔ محبت اور الفت کا علاج بھی ہے کہ نہیں جس سے آنے والی نسل کہ از کم مستفید ہو سکے اور پیار کرنے کے جرم میں موت کو نہ اپنا سکے۔

چاند تاروں کا بن

مخدوم محی الدین

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سر شار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خار زارِ الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا

کچھ اِمامانِ صد مکر و فن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں

تھیں ۔ایک طرح کی پیالی تھی اس پیاس میں بھی ہم خوش تھے۔انھیں پیاسی آنکھوں سے وطن کی آزادی کے خواب دیکھے تھے۔اسی لئے ہر مرد وعورت خوشی سے سرشار تھا۔لیکن جب آزادی صبح نمودار ہوئی تو ساری مستیاں مدہوشیاں اورخواب چور چور ہوگئے۔آزادی کی صبح خوشی کی بجائے غم کا اندھیرا لے کر آئی۔ ہر طرف قتل وغارت گری خوں ریزی کا عالم تھا چند خودغرض سیاسی مفکرین، سیاسی لیڈروں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا زہر بھر دیا۔ جہاں ہندوستانیوں نے متحد ہوکر آزادی کی جنگ لڑی تھی اب بکھر کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔محبت اور قومی یکجہتی کا جو مظاہر ہندو ساتھیوں نے آزادی کی خاطر کیا تھا وہ آزادی حاصل ہونے کے بعد پارہ پارہ ہوگیا۔اس کے پیچھے سیاسی لیڈروں کی چال تھی جو کرسیوں پر بیٹھ کر اپنی چاندی بنانا چاہتے تھے۔

شاعر پھر بھی مایوس نہیں ہے۔کہتا ہے کہ یوں تو نفرت کی آندھی میں محبت بہہ گئی ہے۔اندھیرا چھایا ہوا ہے مگر کہیں کہیں اجالا بھی دکھائی دے رہا ہے اتحاد واتفاق کے نور کی کرنیں بھی دکھائی دے رہی ہیں۔شاعر اپنے ساتھیوں کو آواز دے رہا ہے کہ اے میرے دوستو! ہاتھ میں ہاتھ لے کر منزل کی طرف نکل پڑو۔پیار کی منزل کی طرف اتحاد کی منزل کی طرف اور قومیت اور ایکتا کی منزل کی طرف۔ساتھ میں اپنی اپنی صلیبیں بھی لے کر چلنا کیونکہ تبھی تو ملک سے پاپ دھلے گا اور اس کو سچی اور اصلی آزادی نصیب ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆

MADURAI KAMARAJ UNIVERSITY

(University with Potential for Excellence)

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION

Palkalai Nagar, Madurai - 625 021, India

Ph : 0452-2458471 (30 Lines) Fax : 0452-2458265

E-mail	: mkudde@mkudde.org
General grievances	: mkuddegrievance@gmail.com
UG Courses	: mkuddeug@gmail.com
PG Course	: mkuddepg@gmail.com
MBA Course	: mkuddembag@gmail.com
MCA Course	: mkuddemcag@gmail.com
Education Courses	: mkuddeedu@gmail.com
Website	: www.mkudde.org
IVRS	: 0452 - 2459990
	: 0452 - 2459596

Student Support Service : 0452 - 2458419

DDE - Examinations

Fax No. : 0452 - 2458261
E-mail : mkuace@yahoo.com
Examn., Grievance Redress Cell: 0452-2458471-Extn.515